اور پھر بیاں اپنا

دلی کا محاورہ نئے زمانے کے سانچوں میں ڈھلتا ہے تو کتنا موثر اور دل نشین ہوتا ہے - اور ـ ادیب جب بے جھجک ہمارے سامنے آتا ہے تو اس میں کیا شان محبوبی پیدا ہو جاتی ہے - یہ دونوں باتیں اخلاق احمد دہلوی نے اپنے مضامین کے مجموعے ''اور پھر بیاں اپنا'' کے ذریعے غیر ارادی طور پر ادبی دنیا کو بتائی ہیں -

یہ مضامین مصنف کے مشاہدات ' تجربات و محسوسات کا بے لوث اور پرخلوص بیان ہیں - اس نے اشخاص و اشیاء کے سر بستہ رازوں سے آشنا ہو کر اپنے بیگانے ہر ایک کو جی بھر کے ''رسوا'' کیا ہے - اور ''رسوا کرنے'' کو ایک حسین اور لطیف فن بنایا ہے اس حسن لطافت ' نزاکت اور رعنائی سے دوسروں کو رسوا ہوتے دیکھ کر کون ہے جو رسوا ہونے کی آرزو نہ کرے - اس رسوائی میں عجیب لذت اور عجیب کیفیت ہے -

یہ لذت اور یہ کیفیت دو باتوں نے پیدا کی ہے ــــ شخصیت کے اس خلوص نے 'جس کی تشکیل جرات ' بے باکی ' سچائی اور محبت سے ہوتی ہے اور بیان کی اس بے تکلفی اور بے ساختگی نے جس میں لفظوں کی مزاج دانی اور مرتبہ شناسی کو بڑا دخل ہے -

اخلاق صاحب نے لفظوں کی انفرادی شخصیت ' مزاج اور ماحول کو پہچان کر ان کی بے شمار معنوی تہوں کو ابھارا اور بظاہر معمولی اور حقیر لفظوں اور محاوروں کو معزز ' اور محترم بنایا ہے -

موضوع اور بیان دونوں کے ساتھ محبت اور یگانگت کا وہ رشتہ قائم نہ کیا جائے جو اخلاق صاحب نے کیا ہے تو بات کبھی ایسی نہیں بنتی کہ وہ اپنے دل کی بات معلوم ہونے لگے ' ''اور پھر بیاں اپنا'' میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہمارے دل کی بات ہے جو اس طرح کہی گئی ہے کہ ہم اسے اس طرح نہ کہہ سکتے.........وقار عظیم

اور پھر بیاں اپنا

"اور پھر بیاں اپنا"

اخلاق احمد دہلوی

اردو مرکز ○ لاہور

ناشر ○ اُردو مرکز ○ لاہور
طابع ○ نقوش پریس لاہور
تعداد ○ ایک ہزار
قیمت ○

سن طباعت
۱۹۵۷

صدر دفتر
اُردو اکیڈمی سندھ
نزد مسافر خانہ بندر روڈ
کراچی

فہرست مضامین

انتساب

ماضی کی یادوں

اور

مستقبل کی امیدوں

کے نام

میراجی کا اخلاق

تقریباً دس، برس پہلے جب میں لاہور میں پہلی دفعہ میراجی سے ملا تو میں انھیں دیکھ کر ڈر گیا۔ میں نے اس سے پہلے اس ہیئت کا کوئی شاعر یا ادیب نہیں دیکھا تھا۔ ہم لوگ دلی سے تفریحاً لاہور آئے تھے۔ شاہد صاحب، محمد مرزا صاحب دہلوی ظفر قریشی صاحب اور وصی اشرف صاحب۔ جب ہم "ادبی دنیا" کے دفتر میں مولانا صلاح الدین صاحب اور میراجی سے ملنے کے لئے پہنچے تو "ادبی دنیا" کے دفتر میں کوئی نہ تھا۔ صرف ایک عجیب وغریب حلیئے کا آدمی ایک کرسی پر "اُردو" میں بیٹھا کتابت کر رہا تھا۔ یہ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص ہمیشہ ہی کرسی پر "اردو" میں بیٹھا کرتا تھا۔ یعنی پاؤں اُٹھا کر —— اکڑوں —!

شاہد صاحب نے اس غیر معمولی کاتب سے کہا ہمیں مولانا صلاح الدین صاحب سے ملنا ہے۔ کاتب نے جواب میں اس طرح کھڑے ہونے کی کوشش کی کہ ہم سب کا جی چاہا کہ اسے سہارا دیں، کہیں گر نہ پڑے لیکن کاتب فوجیوں کی طرح سیدھا کھڑا ہوگیا اور ایک خاص کھرج دار آواز کمرے میں گونجی۔ "معاف فرمایئے صلاح الدین صاحب اس وقت دفتر میں نہیں ہیں۔"

مجھے آج تک یاد ہے۔ ہم سب یہ آواز سن کر کچھ مرعوب سے ہو گئے تھے۔ شاہد صاحب

بہ مشکل تمام یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے ـــــ اور میراجی ـــــ!! ـــــ جواب ملا ـــــ یہ خاکسار ہی ہے۔ ہم میں سے کسی کو یقین نہ آیا۔ اس چیز کو بھلا میراجی کیسے سمجھ لیتے ـــــ؟! اتنا مشہور شاعر اور یہ وضع ـــــ! میراجی نے کچھ جاپانی طریقے پر جھک کر ہم سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میری کیفیت اس وقت بالکل اس قسم کی تھی جیسے مجھ پر کوئی "ہپناٹزم" کا عمل کر رہا ہو ـــــ تو آپ ـــــ آپ ہیں میراجی! میری آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ جی!! بہت ہی کراری آواز میں جواب ملا۔ ظفر قریشی صاحب نے کچھ مصرع سا اٹھانے کی کوشش کی ـــــ یہ آپ نے گرمیوں میں گرم کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں۔ شاہد صاحب نے شاہد نثر میں گرہ لگا ـــــ "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے"۔ مرزا صاحب نے اپنے خاص انداز میں قہقہہ سر کیا۔ اور ہم سب کو اس "سوشل" قہقہے میں شرکت کرنی پڑی۔ میراجی بھی مصنوعی انداز میں ہنسے۔ کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ میراجی کو ہنسنا آتا ہی نہ تھا وہ دوسروں کو ہنسا سکتے تھے ـــــ!! اس سوشل قہقہے کے خاتمے پر میراجی نے بتایا کہ ان کے پاس ٹھنڈے کپڑے سرے سے ہیں ہی نہیں ـــــ! اگر جاڑے یہی لبادہ پہنتے ہیں کیا واہیات ہے۔ مرزا صاحب اپنی روزمرہ پر اتر آئے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس گرمیوں کا لباس نہ ہو۔ میراجی نے بہت ہی جمے ہوئے لہجے میں جواب دیا ـــــ ہو سکتا ہے ـــــ!!

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مولانا صلاح الدین صاحب اور ان کے ساتھ کچھ اور حضرات کمرے میں داخل ہوئے۔ صلاح الدین صاحب نے بہت خوش ہو کر شاہد صاحب سے مصافحہ کیا۔ ہم سب کھڑے ہو گئے۔ صلاح الدین صاحب نے باقی حضرات کا تعارف شاہد صاحب سے یوں کرایا۔ آپ ہیں حفیظ صاحب ہوشیارپوری۔ کرشن چندر صاحب

اپندر ناتھ صاحب اشک اور راجندر سنگھ بیدی صاحب۔ میراجی نے آنے والے حضرات کی طرف رخ کیا اور آواز بلند کہا۔ شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر ماہنامہ ساقی دلّی اور پھر کہا معاف فرمایئے باقی حضرات سے میں ابھی خود واقف نہیں۔ شاہد صاحب نے ہم سب کا تعارف کرایا اور پھر میراجی سے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں شاہد ہوں؟ جواب ملا آپ کی صورت شاہد ہے! میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہیں اور شاید آپ کی بھی، مرزا صاحب کی طرف میراجی نے اشارہ کیا۔ آپ کی کتاب "اناترک حال ہی میں ریویو کے لئے آئی ہے۔ آئندہ اشاعت میں میں "اناترک" پر ریویو لکھ دونگا۔

مرزا صاحب کی کچھ تیوری چڑھ گئی۔ مرزا صاحب جیسے بہترین لباس پہننے والے مصنف پر وہ شخص ریویو کرے جس کے پاس گرمیوں کا لباس تک نہ ہو یہ انھیں اپنی ایک طرح سے توہین معلوم ہوئی۔ اور پھر سب باتوں میں لگ گئے۔ مرزا صاحب نے ایک "قد آدم" سگار سلگایا اور ادب کے تجارتی پہلوؤں پر روشنی پڑنے لگی۔ شاہد صاحب "دہ شہر پر بیوی" کی نئی کاپیاں آپ نے لکھوالیں۔۔۔؟! اپندر ناتھ اشک بولے کونپل کے تو "پروف" اب تیار ہو گئے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ دو ہزار ہی چھپوایئے اور پھر بڑی دیر تک دو ہزار، ایک ہزار، اشتہارات "پروف" لتھو، پرنٹنگ کی مشکلات اور ایسے ہی غیر دلچسپ مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔

بکایک سب نے میراجی کو یہ کہتے سنا حضرات، شری اپندر ناتھ اشک اپنی کویتا سنائیں گے۔ جیسے ریڈیو پر اعلان کیا گیا ہو اور اشک صاحب بلا تکلف شروع تھے

"ہم ملے مجھے معلوم ہوا تم چڑیا ہو، چوں چوں کرتی، اڑ جاتی۔ اور ہم ملے مجھے معلوم ہوا تم ندی ہو، بل کھاتی، لہراتی وغیرہ۔" میراجی نے پھر اعلان کیا صاحبو" میں خودکشی

کرنا چاہتا ہوں "۔ !! معاف فرمایئے میرا "موڈ" یکا یک خود کشی کا ہوگیا ہے! یہ نعرہ سن کر
سب دھم ہو گئے۔ شاہد صاحب برجستہ بولے کیا اشک صاحب کی "کویتا" آپ کو
اتنی ناگوار گذری ۔۔۔ جی نہیں ۔۔۔ میرا جی نے کہا۔ درحقیقت آج کل میں یورپ کے قتل
کے مقدمات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میرے پاس سینکڑوں ایسے اشخاص کی تصویریں جمع
ہیں جنھوں نے بڑے پراسرار طریقے سے قتل کئے لیکن آخر یورپ اور امریکہ کی پولیس نے
ان قاتلوں کا کھوج لگا لیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں دنیا میں اپنے سوا کسی کو قتل
نہیں کر سکتا۔ تاکہ بعد میں پولیس میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ میری لاش کا
"تجزیہ" کسی اچھے ہسپتال میں اعلیٰ درجے کے ڈاکٹروں کے ہاتھوں کرایا جائے۔ ظفر قریشی
نے ذرا بے تکلف ہو کر کہا۔ میرا جی آپ پر اس وقت یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آپ کی
یہ گفتگو تقریباً بے موقع سی ہے۔ میرا جی نے کہا آپ نے "یہ سی" لگا کر اپنے دلی والے
ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ میں نے آپ کے افسانے پڑھے ہیں۔ آپ کی تحریر میں
"دہلویت" اتنی نہیں ہے لیکن بات چیت سے آپ پورے پورے دلی والے معلوم
ہوتے ہیں ۔۔۔ ظفر قریشی نے کہا میں کبھی کچھ عرصے آپ کے لاہور میں "ادبی دنیا
کے ادارے میں کام کرتا رہا ہوں مولانا تاجور کی نگرانی میں۔ آپ سے مل کر
اور بھی خوشی ہوئی۔ میرا جی نے کہا۔ لیکن معاف فرمایئے آپ کی یہ گفتگو بھی کچھ بے موقع سی"
ہے۔" میرا جی نے "سی" پر کچھ اس طرح سے زور دیا کہ سب ہنس پڑے۔ پھر حفیظ صاحب
ہوشیارپوری سے درخواست کی گئی۔ حفیظ صاحب نے غزل سنائی اور اب خود
میرا جی کی باری تھی۔ کہنے لگے معاف فرمایئے حضرات میں گاؤں گا۔ کیونکہ اکثر
لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "بلینک ورس" اور "فری ورس" کو گایا نہیں جا سکتا۔ شاہد صاحب

یکایک میراجی کی طرف سب سے زیادہ متوجہ ہو گئے کیونکہ انہیں موسیقی اور ادب دونوں سے برابر کا لگاؤ ہے۔

میراجی نے گانا شروع کیا۔ "جے جے ونتی" شاہد صاحب نے فوراً حاضرین سے راگ کا تعارف کرایا اور میراجی گاتے گاتے رونے لگے۔ سب کو حیرت تھی کہ یہ روئے کیوں ــــ؟ کیا اس لئے کہ ان کی نظم کی صحیح داد نہ مل سکی۔ میں نے جلدی سے ان کا دل رکھنے کے لئے کہا بہت اچھی نظم تھی اور میراجی بچوں کی طرح روتے روتے ایک دم خوش ہو گئے اور پھر خود ہی کہا مجھے "جے جے ونتی راگ بہت پسند ہے۔! یہ جب میں خود گاؤں یا کسی اور سے سنوں تو مجھے رونا آجاتا ہے۔ آپ لوگ گھبرائیں نہیں ــــ!! چائے وغیرہ پی گئی ــــ اور پھر ملنے کے "وعدے وعید" ہو کر محفل برخاست ہوئی۔

مرزا صاحب نے باہر نکل کر کہا۔ یہ شخص پاگل تھا۔ شاہد صاحب بولے میں نے بھی اتنا عجیب و غریب آدمی آج تک نہیں دیکھا ظفر صاحب نے کہا بعض لوگ جان بوجھ کر بنتے ہیں۔ مجھے یہ سب STUNT معلوم ہوتا ہے FRAUD! یہ شخص دیوانہ ہرگز نہیں۔ اور مجھ سے مارے ڈر کے کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ قتل کے مقدموں کا مطالعہ، خودکشی کا ارادہ، کسی راگ سے کوئی خاص اثر لینا۔ یہ سب باتیں میرے دماغ میں گھوم رہی تھیں اور میراجی کی شخصیت کی ایک ہیبت سی مجھ پر طاری ہو کر رہ گئی تھی۔

لاہور کی اس ملاقات کے پورے ایک برس بعد میراجی دلی آئے شاہد صاحب کے مکان پر اور کتب خانہ علم و ادب پر اکثر یہ آتے اور خوب جی بھر کر باتیں کرتے دلی میں شام کو کتب خانہ علم و ادب پر اکثر ادیبوں کا مجمع رہتا تھا۔ شاہد صاحب

سید انصار ناصری صاحب، ظفر قریشی صاحب، صادق الخیری صاحب، تابش صاحب دہلوی، فضل حق قریشی دہلوی، صلاح الدین قریشی صاحب دہلوی، مرزا فہیم بیگ چغتائی مرحوم، اشرف صبوحی صاحب دہلوی، محمد مرزا صاحب اور بیر ولایت حسین صاحب خمار دہلوی مستقل آنے والوں میں سے تھے۔ ان کے علاوہ کہیں سے بھی کوئی ادیب یا شاعر آتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بغیر کتب خانہ بمبئی میں آئے دہلی سے واپس چلا جائے۔ میراجی بھی یہاں روز شام کو آنے لگے۔ شروع شروع میں ان کی باتیں کچھ سمجھ میں نہ آئیں لیکن کچھ عرصہ بعد یہ ہر دل عزیز ہونے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ حد یہ کہ محمد مرزا صاحب دہلوی بھی انھیں پسند کرنے لگے۔ کبھی کبھی ان کے لباس پر ان کو اعتراض ہوتا تھا۔ لیکن میراجی کی ذہانت اور بے پناہ خلوص کا لوہا وہ ضرور ماننے لگے۔ ظفر قریشی صاحب جنھوں نے پہلی ملاقات میں میراجی کو STUNT اور FRAUD گردانا تھا اب ان کا دم بھرنے لگے تھے۔ ظفر صاحب سے اور مجھ سے میراجی کی خاص دوستی ہو گئی۔ وجہ یہ کہ باقی حضرات میراجی کی نجی زندگی سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ میراجی کی ظاہری شخصیت کی ہیبت میرے دل سے کم ہو گئی۔ اب میں زیادہ وقت ان کے ساتھ رہنے لگا

ایک مرتبہ کسی نے کہا تعجب ہے شاہد صاحب شراب نہیں پیتے۔ جواب میں جوش ملیح آبادی کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

ساقی کے مہ پارہ و رنگ ناب سے دور

بہ بد نہند نام زندگی کا نور

میراجی نے گلاس اٹھا کر کہا۔ جوش اور شاہد کے لئے۔ اسرار الحق مجاز

جاں نثار اختر، ایم۔ اے لطیف بی۔ اے، اسلام الدین اور شو شنکر سنگھ ٹھاکر نے جنھیں اختصار کی وجہ سے تھری ''ایس'' ٹھاکر کہا جاتا تھا۔ میراجی کے ساتھ اپنے اپنے گلاس بلند کئے اور سب نے مل کر جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی کا جامِ صحت پیا۔

میراجی تقریباً چھ برس تک باقاعدہ دلّی میں رہے اور دلّی کے ادیبوں سے لے کر، دلّی کے تانگے والوں اور فقیروں تک سے یکساں خلوص کے ساتھ ملتے رہے وہ انسان انسان میں فرق کرنا نہیں جانتے تھے۔ کہتے تھے۔ گاندھی جی چاہے بھنگی کولونی میں رہیں یا بھنگی'' گاندھی کولونی میں۔ میرے لئے سب برابر ہے۔ کبھی کبھی زیادہ نشے کی حالت میں وہ ایک شکایت اکثر کرتے تھے کہ ''میری والدہ میری مادری زبان سے ناواقف ہیں۔'' وہ کہتے تھے میری مادری زبان اردو ہے۔ اس صدمے سے وہ کبھی کبھی رونے لگتے اور یہ بھی کہتے تھے کہ تم دیکھو گے کہ میں آخر میں بنگال چلا جاؤں گا، ''بنگلہ بڑی میٹھی بھاشا ہے مگر میں بنگال میں اردو رائج کرنا چاہتا ہوں۔

میراجی کی تین مستقل محبوبائیں تھیں'' میرا سین'' وہ بنگالن لڑکی جو ایف۔ سی۔ کالج لاہور کی طالبہ تھی اور جس کی وجہ سے انھوں نے اپنا نام تبدیل کیا۔ اُردو زبان۔ جو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی اور انگلش بکیز جس کے دیکھنے کا ان کو بچپن سے شوق تھا۔ میرا سین کے لئے میں نے مستقل کا لفظ یوں استعمال کیا ہے کہ میراجی نے دلّی میں دو اور لڑکیوں سے بھی عشق کیا۔ جی ہاں عشق — !! جن میں سے ایک کو وہ اپنے طور پر پیار سے بلی خانم اور دوسری کو پیار سے بدلی اور بادلی بیگم کہا کرتے تھے۔ میراجی کہتے تھے عشق ایک پل کا بھی ہو سکتا ہے اور ایک عمر کا بھی۔ عمر کے مختلف حصوں میں مختلف

افراد سے محبت ہو سکتی ہے مگر بعض نقش بہت گہرا بیٹھتا ہے اور وہ نقش ایک بنگالن ہی کا ہو سکتا ہے۔ ان دونوں لڑکیوں میں میراجی کو اپنی مستقل محبوبہ میرا سین کے کچھ نقوش ملتے تھے۔ میراجی کی صحت پر ان لڑکیوں کے عشق کا کافی بُرا اثر پڑا۔ وہ اور زیادہ شراب پینے لگے۔ اکثر نشے کی حالت میں وہ یہ شعر پڑھتے اور روتے روتے ان کی ہچکی بندھ جاتی

ہر گز نہ کیجو ان سے محبت تو مصحفیؔ

ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں

جب میراجی اپنی دانست میں سمجھ لیتے کہ تخلیہ ہو گیا تو اپنے گلے کی ہند دانی مالائیں گریبان سے باہر نکال لیتے اور ان مالاؤں کے ایک ایک دانے پر میرا میرا پڑھتے اور بالکل اس آسن میں ہو بیٹھتے جس طرح سادھو گیان دھیان میں بیٹھتے ہیں کبھی کبھی میرا کے بھجن بھی گاتے تھے! ان کا مطالعہ مذہبیات، جنسیات اور نفسیات پر بے پناہ تھا۔ HINDU MYTHOLOGY سے انھیں خاص شغف تھا۔ شاید اس لئے کہ ان کی محبوبہ "کافر" تھی۔ میراجی خود لاڈ میں کبھی کبھی میرا سین کو "کافر" کہا کرتے تھے۔ ان کے پاس میرا سین کی ایک تصویر تھی جو کسی کالج میگزین میں سے انھوں نے تراش لی تھی اور میرا سین کی ایک حساب کی کاپی جو کسی دن کالج جاتے وقت شاید بے کار سمجھ کر اس نے پھینک دی تھی۔ میراجی اکثر جنون کی حالت میں اس کاپی کو آنکھوں سے لگاتے اور گھنٹوں "میرا سین" کی تصویر ایک پرانے آئی گلاس سے دیکھتے۔ اس شیشے کی وجہ سے شکل بڑی معلوم ہونے لگتی اور میراجی اکثر اس حالت میں نظمیں کہتے۔ بیسیوں نظمیں اسی کیفیت میں میراجی نے کہیں۔ میراجی ہر نظم شروع کرنے سے پہلے کاغذ پر دیوناگری رسم الخط میں اُوم لکھتے۔ ایک طرف تو "اوم" سے انھیں کچھ ایسی عقیدت تھی کہ اپنے دستخط بھی کبھی

بغیر "ادم" لکھے نہ کرتے، اور دوسری طرف یہ عالم بھی دیکھنے میں آتا کہ قاری زاہر القاسمی سے بالکل تخلیہ میں قرآن شریف سنتے اور روتے۔

اپنے دلّی کے قیام میں میراجی نے جب کوئی نظم لکھی شائع ہونے سے پہلے ہم لوگوں کو سنائی۔ ہم لوگوں سے یہاں میری مراد ہے ٹھری ایس ٹھاکر، اسلام الدین ایم۔ اے لطیف بی۔ اے اور میں۔ میراجی کہتے تھے یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ایک شخص پہلے ایم۔ اے ہوا اور پھر بی۔ اے۔ ایم، اے لطیف بی اے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ہم وطن تھے، اور تقریباً آٹھ نو سال یورپ میں یوں ہی ہش گڈ ا پھرنے کے بعد واپس آ گئے تھے۔ لباس اور صورت شکل سے انگریز نژاد معلوم ہوتے لیکن اطوار و عادات کے لحاظ سے اس قدر دیسی کہ ولایتی شراب پینے میں تکلف برتتے۔ میراجی سے انھیں عشق تھا۔ ذرا ہکلا کر بولتے تھے۔ اسی لحاظ سے میراجی کہا کرتے تھے اگر KINGIS-ENGLISH سننی ہو تو ایم۔ اے لطیف بی۔ اے سے ملو۔ اکثر اپنے ملاقاتیوں سے اسی طرح ان کا تعارف کراتے۔ انھیں کی وجہ سے میراجی نے فلم کا رخ کیا۔

ہم لوگ اکثر یہ سوچا کرتے تھے کہ کیسے کوئی ایسی فلم کمپنی ڈھال لیں جس میں اپنی مرضی کے فلم بنائیں۔ روپے کا سوال نہ تھا کیونکہ روپیہ ٹھاکر کے پاس تھا لیکن ایک مشکل یہ تھی کہ ٹھاکر کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے چچا ٹھاکر کے دلی اور شملے کے ہوٹلوں کے نگراں تھے اور ٹھاکر ہر سال ہوٹلوں کی آمدنی کا لاکھوں روپیہ یوں وصول نہ کر سکتے تھے کہ ان کے چچا رقم کا کچھ ایسا حساب لگا کر ایس۔ ایس ٹھاکر کو دیتے جس کا حاصل جمع آٹھ ہوتا اور اس آٹھ کے چکر نے ٹھاکر تباہ کر رکھا تھا۔ وہ ایسی رقم لینے سے ہمیشہ انکار کر دیتے جس کا حاصل جمع آٹھ ہو۔ نتیجہ یہ کہ ٹھاکر کی مالی حالت بد سے بدتر

ہوتی جا رہی تھی۔ صرف اپنے دلی والے ہوٹل کے ایک کمرے میں وہ خود رہتے اور
کھانے پینے کی طرف سے انہیں قدرے بے فکری تھی۔ سامان ٹھاکر کے پاس مطلق کچھ
نہیں تھا یعنی بستر تک ندارد۔ صرف تن کے کپڑے اور ان کا بھی یہ حال کہ روز صبح جب
غسل خانے جاتے تو کپڑے اتار کر دھوبی کو دیتے اور جب تک ہوٹل کا دھوبی انہیں دھو کر
سکھا کر اور استری کر کے واپس نہ لاتا، غسل خانے میں بیٹھے سگرٹ پیا کرتے اور اخبار پڑھتے
کبھی کوئی ایسی رقم اگر ان کو ملتی جس کا حاصل جمع آٹھ نہ ہوتا تو اُسے فوراً ضرورت مندوں
میں تقسیم کر دیتے۔ ٹھاکر کو آٹھ کا جنون یہاں تک تھا کہ سائیکل پر کبھی نہ بیٹھتے کیونکہ اس کے
دونوں پہیے مل کر آٹھ کے ہندسے کی شکل بن جاتے ہیں اور کیپسٹن سگرٹ کو کبھی ہاتھ
نہ لگاتے کیونکہ کیپسٹن سگرٹ کو سترہ میڈل انعام کے مل چکے ہیں اور سترہ کا حاصل جمع
آٹھ ہوتا ہے۔ ٹھاکر کی انھیں اداؤں نے میرا جی کا دل موہ لیا تھا۔

ایک دن ہم سب فلم کمپنی ہی کی دھن میں کہیں جا رہے تھے، راستے میں سڑک کے
ایک سنسان کنارے پر ایک سادھو بھبوت رمائے آٹھ کا ہندسہ بنا پڑا تھا۔ ٹھاکر کی چیخ
نکل گئی۔ ہم لوگ قریب پہنچے آٹھ کے ہندسے میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ اسلام الدین نے
اس سادھو کو ٹٹول کر دیکھا۔ میرے منہ سے نکلا ؎

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

میرا جی سر پکڑ کر سادھو کے سرہانے بیٹھ گئے۔ ایم۔ اے۔ لطیف۔ بی۔ اے نے کہا
فی الحال ہم فلم کمپنی کا مسئلہ ملتوی کرتے ہیں۔ ان صاحب کی تکفین کا انتظام مقدم ہے
میرا جی نے کہا سب سے پہلے ہمیں اس کی لاش پر آنسو بہانے ہیں کیونکہ اس بوڑھے
کی موت پر کوئی دو آنسو بہانے والا بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ تھوڑی دیر بعد

جوں توں کر کے سادھو کی اوّل منزل کا انتظام ہو سکا اور ہم لوگ اس بے کسی کی موت سے نڈھال ہو کر ایک قریب کے میکدے میں جا بیٹھے۔ میرا جی نے گلاس اٹھایا اور کہا "اس بڈھے کے لئے جس کی لاش پر کوئی رونے والا نہ تھا"۔ سب نے خاموشی سے اپنے اپنے گلاس میرا جی کے گلاس کے ساتھ بلند کیے اور زہر مار کر لئے۔!!

میرا جی نے کہا میں آج کسی ظالم افسر کا "آملیٹ" نہیں بناؤں گا۔ آج مجھے اپنا ہی "آملیٹ" بنانا ہے۔ اور ہم سب کے روکتے روکتے میرا جی نے اپنا آملیٹ بنانا شروع کیا۔ اسلام الدین بمشکل میرا جی کے ہاتھ سے وہ لوہے کے گولے چھین سکے جو میرا جی ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے اور جن سے وہ اکثر خود سر افسروں کا آملیٹ بنایا کرتے تھے۔ یہ گولے وہ تھے جو مداری بازی گری کے وقت اپنے منھ سے نکال کر لوگوں کو دکھاتا ہے۔ خدا معلوم یہ میرا جی کے ہاتھ کہاں سے لگے ان گولوں پر سگریٹوں کی پنی تہ بہ تہ چڑھی رہتی تھی اور دور سے یہ بالکل چاندی کے معلوم ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے ایک بھی گولہ کبھی ادھر ادھر ہو جاتا تو میرا جی بے چین ہو جاتے۔ ان گولوں کو وہ خود فہم کے انڈے "BALLS OF WISDOM" کہا کرتے تھے گولے چھن جانے سے میرا جی کچھ بے دست و پا سے ہو گئے اور گلاس اٹھا کر اپنے چہرے پر پوری طاقت سے مارا۔ سارا چہرہ لہولہان ہو گیا اور اب ان پر پورا پورا خودکشی کا موڈ طاری ہو چکا تھا۔ یہ وقت ہم لوگوں کے لئے بہت آزمائش کا ہوتا تھا کیونکہ اس قسم کی کیفیت جب ان پر طاری ہوتی تو پھر وہ کسی کی بات نہ سنتے اور اپنا سر دیواروں سے ٹکراتے!! اور سچ مچ خودکشی کر لینے پر تل جاتے اسلام الدین ایسے موقعوں پر سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتے۔ اور اس مرتبہ بھی ہمت کر کے

اسلام الدین ہی نے انھیں روکا۔ میں نے کہا اگر یہی لیل و نہار رہیں تو پھر ہم سب کو
صحرا میں نکل جانا چاہیئے کیونکہ غالب کی اطلاع کے مطابق وہاں کوئی دیوار نہیں
ٹھا کرنے کہا مگر یہ گو ہے !! ان کا کیا علاج ہے اور ہم سب جیسے قائل سے ہو گئے
اور پھر شہر ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں کہنے کو میرا جی پطرس صاحب کے
INTELLECTUAL GROUP میں بھی شرکت کرتے۔ شاہد صاحب کی بزمِ
تہذیبِ ادب میں شامل ہوتے، نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی کی "محفل ادب" میں بھی
اپنی نظمیں سناتے اور دلّی میں حلقۂ اربابِ ذوق کی شاخ کے جلسوں کو بھی حتی الامکان
کامیاب بناتے جس کے روحِ رواں ان دنوں دلّی میں ہزا یکسی لینسی محمد خلیل الرحمٰن،
مختار صدیقی، مسعود الحسن تابش دہلوی، اعجاز بٹالوی اور ضیا جالندھری تھے لیکن
شاید روحانی سکون انھیں ہم لوگوں ہی میں میسر آتا۔ شروع شروع میں دلّی میں راشد صاحب
نے ان کے بہت ناز اٹھائے۔ راشد صاحب کے ایران جانے کے بعد میرا جی کی
حالت بہت نازک ہو گئی اور تقریباً روز ہی خودکشی کا موڈ ان پر سوار رہنے لگا۔
کچھ عرصے تک محمود نظامی صاحب نے انھیں سنبھالے رکھا لیکن راشد صاحب کی
یاد ان کے دل سے محو نہ ہو سکی۔ میرا جی راشد صاحب کی آواز سننے کے لئے اکثر
ایران کی نشریات سنتے اور کہتے، دوست چلا گیا۔!! ن۔م۔ راشد صاحب کے
ایران جانے کے کچھ عرصے بعد میں ایک دفعہ کوئی رات کے تین بجے کے قریب
شاید کسی نھبر ڑے سے واپس آرہا تھا کہ بیچ چاندنی چوک میں دلّی کی اس مشہور سڑک
کے سب سے اہم چوراہے "پر فوارے" کے سامنے میں نے دیکھا کہ ایک آدمی
بے سُدھ پڑا ہے۔ محض اس خیال سے کہ کہیں کوئی فوجی ٹرک اس شخص کو کچلتی ہوئی

نہ گذر جائے۔ میں قریب پہنچا اور چاہا کہ اس شخص کو اُٹھا کر کسی دوکان کے تختے پر لٹا دوں۔ نزدیک پہنچ کر پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ آپ ہیں۔!!
ایک ٹانگہ قریب سے گذرا۔ میں نے تانگہ ٹھہرایا اور تانگے والے نے اور میں نے مل کر انھیں تانگے میں بھر دیا۔ سوار کراتے وقت تانگے والے کی نظر ان کے چہرے پر بھی پڑی، اور اُس نے چیخ کر کہا۔ ارے بابوجی۔!! میں نے پوچھا کیا تم انھیں جانتے ہو؟ وہ بولا جی ہاں "۔ ایک دفعہ بابوجی نے اتنی سی دور کے مجھے سو روپے دیئے تھے۔ کہا تھا "جا بچہ تیرا کلیان ہو"!۔ آج بھی معلوم ہوتا ہے بہت پی رکھی ہے۔ میں ان بابوجی کا گھر جانتا ہوں بنگش کے پل پر رہتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر چلو بابوجی کو گھر پہنچانا ہے لیکن آج تمھیں ایک ہی روپیہ ملے گا۔ کیونکہ میرے پاس اس وقت ایک ہی روپیہ ہے۔ تانگے والے نے کہا حضور آپ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ ایک پیسہ بھی نہ دیجیے اور تانگہ بنگش کے پل کی طرف ہانک دیا

میں نے میراجی کو گھر پہنچایا۔ تالے کنجی کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اندر ایک کمرہ تھا جس میں کتابوں اور رسالوں کا بے ترتیب انبار لگا ہوا تھا۔ نہ تکیہ نہ بستر، اوڑھنا نہ بچھونا۔ میں نے میراجی کی جیبیں ٹٹولیں چار سو روپے ابھی باقی تھے خدا معلوم یہ کس طرح بچ گئے۔ شاید انھیں سڑک پر اُچھالنے سے پہلے یہ بے ہوش ہو گئے کیونکہ یہی ان کی عادت تھی۔ اکثر میرے علم میں ان کے مجموعوں کے انھیں سات سات سو، آٹھ آٹھ سو روپے ملے لیکن دوسرے ہی دن میں نے میراجی کو کوڑی کوڑی کا محتاج پایا۔ پینے پلانے کے بعد، جو کچھ بچتا وہ چپڑاسیوں بھنگیوں اور تانگے والوں میں بانٹ دیتے اور پھر بھی اگر کچھ روپے بچ رہتے تو

انھیں سڑک پر اچھال دیتے اور خالی ہاتھ گرتے پڑتے گھر جا کر سو جاتے۔ چار سو روپے میں نے ان کی جیب سے نکال کر احتیاطاً اپنے پاس رکھ لئے۔

دوسرے دن میراجی سے حسب معمول ملاقات ہوئی میں نے پوچھا رات آپ گھر کیسے پہنچے۔؟ کہنے لگے جیسے روز پہنچتا ہوں۔ میں نے پوچھا آپ کا کل رات کچھ نقصان تو نہیں ہوا۔؟ میراجی نے کہا فقیر کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ہاں البتہ یہ یاد نہیں آتا کہ کل شام جو نئے مجموعے کی رقم مجھے ملی اس کا کچھ حصہ میں نے گھر منی آرڈر کیا یا نہیں۔؟ میں والدہ کو کچھ روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا کتنے روپے ملے تھے؟ کہا کچھ یاد نہیں آتا۔ بہرحال اچھی خاصی رقم شاہد صاحب نے دی تھی۔ پانچ ہزار چھ سو چھبیس روپے چھ آنے چھ پائی۔ اور پھر اپنی آواز میں اپنے ہی انداز کا جھٹکا پیدا کر کے کہا۔ چھوڑ و روپے آنے پائی کے ذکر کو، یہ بتاؤ صبح سے بلی خانم یا بادلی بیگم میں سے کسی سے ملاقات ہوئی؟ میں نے کہا ہاں۔ کہنے لگے آج راستے میں بہت بنگالنوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پانچ ہزار چھ سو چھبیس بنگالنیں آج ہی آج میں مل چکی ہیں۔ یہ دلی میں بنگال کا جادو کہاں سے اتنا آگیا — میرا موڈ اس وقت بہت خراب ہے اور پھر کہا تم بادلی بیگم سے شادی کر لو۔ میں نے کہا — میرے پاس شادی کے لئے روپیہ نہیں۔ کہا روپیہ میں مہیا کر دوں گا۔ تم کل شادی کر لو۔ بادلی بیگم تمھیں بہت پسند کرتی ہے اور ویسے خود بھی اچھی لڑکی ہے اور پھر یہ کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ میں نے کہا آپ کی محبوبہ سے میں کیسے شادی کر لوں میراجی نے کہا اس لئے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی اور پھر کوئی تیسرا آدمی اسے فضول لے کر چلتا بنے گا۔ تمھارے پاس رہے گی تو میں بھی دیکھ لیا کروں گا۔ یہ کہتے کہتے

میراجی کو غصہ آگیا، ایک دم چہرہ تمتمانے لگا۔ اور حکم سنایا اگر تم نے کل اس سے شادی نہیں کی تو پھر میں تمہارا "آملیٹ" بنا دوں گا۔ آملیٹ کا نام سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ سزا میراجی نے صرف "فرعون باسامان" قسم کے افسروں کے لئے رکھی تھی۔ توبہ۔ جب انھیں کسی افسر کا "آملیٹ" بنانا ہوتا تو اس کے پاس جاتے اور کہتے آج رات میں آپ کا "آملیٹ" بناؤں گا۔ رات کو چھ ہزار چھ سو چھبیس بج کر انسٹھ منٹ پر اور دوسرے دن سب سنتے کہ وہ افسر یا تو ہسپتال میں ہیں یا گھر ہی پر چھٹیں مبہنگ رہے ہیں تعجب یہ تھا کہ ہر افسر آملیٹ بننے کے بعد میراجی کا مرید ہو جاتا اور جو میراجی کہتے کرتا۔ میراجی نے گرج کر کہا۔ آج رات کو چھ ہزار چھ سو چھبیس بج کر انسٹھ منٹ پر تم اپنا "آملیٹ" بنا ہوا پاؤ گے۔ اور میراجی نے حسب معمول اپنا وعدہ پورا کیا میرا آملیٹ بن چکا تھا!! ایم۔ اے لطیف بی۔ اے۔ ایس۔ ایس۔ ایس ٹھاکر اور اسلام الدین سب کو حیرت تھی کہ یہ آخر اخلاق کا آملیٹ کیوں بنا۔!! اور سب اپنی اپنی جگہ ڈر رہے تھے ایم۔ اے لطیف بی۔ اے نے کہا ع

آج وہ کل ہماری باری ہے

ٹھاکر صاحب کو پسینہ آگیا۔ آخر وجہ کیا؟! میں اور میراجی دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ اسلام الدین نے جیسے آسمان سے باتیں کرنی شروع کیں۔ یہ "آملیٹ" نہیں بننا چاہتے تھے۔ میراجی نے ڈانٹ کر گھٹی ہوئی آواز میں کہا بکو مت! میں نے چوٹوں کی شدت روح کی گہرائی تک محسوس کی اور میراجی سے کہا۔ میرے آپ کے تعلقات آج سے ختم اور چار سو روپے ان کو یہ کہہ کر واپس کر دئے کہ یہ آپ کے ہیں یہ لیجئے اور آئندہ مجھ سے ملنے کی کبھی کوشش نہ کیجئے۔ میراجی رونے لگے۔

ایم-اے لطیف بی-اے- اسلام الدین اور ایس-ایس-ایس ٹھاکر نے تجویز پیش کی آؤ سب مل کر کہیں بیٹھ جائیں اور پئیں- میں نے کہا مجھ پر آج سے وہ شراب حرام ہے جس میں میراجی بھی شرکت کریں- میراجی نے کہا اخلاق صاحب مجھے معاف کر دیجئے!! اور پلک جھپکتے میں ہم دونوں گلے مل گئے جیسے برسوں کے بچھڑے ملیں- میراجی نے "ہومیوپیتھک" طریقے پر میری چوٹوں کا علاج شروع کیا- کیونکہ "ہومیوپیتھک" علاج سے انھیں بہت عقیدت تھی اور خود اس علم سے بخوبی واقف تھے۔ "آملیٹ" بنانے کے بعد وہ خود ہی ہر ایک کی تیمارداری بھی کیا کرتے تھے- چنانچہ میرے ساتھ بھی انھوں نے یہ رواداری برتی-

مجھ سے پوچھا یہ چار سو روپے کیسے تھے- میں نے بتایا سخت متعجب ہوئے- کہنے لگے کمال کر دیا- مجھے تو بالکل یاد نہیں تھے- میں نے کہا یہ میں نے اس وقت کے لئے رکھ لئے تھے جب آپ کو حقیقی معنوں میں روپیوں کی ضرورت ہو- ویسے روز کا کام تو کسی نہ کسی طرح چل ہی جاتا ہے لیکن اس وقت غصے میں میں نے یہ آپ کو دے دیئے میراجی نے کہا یہ روپے میں والدہ کو بھیجدوں گا- ماں بڑی نعمت ہے!! اور پھر اپنی ایک کتاب مجھے دی گیتوں کا مجموعہ "گیت ہی گیت"- میں نے کتاب کھولی لکھا تھا—

"اخلاق احمد کے نام جسے ان گیتوں کے ماخذ معلوم ہیں"- مجھے معلوم تھا بہت سے گیت میراجی نے بلی خانم اور بادل بیگم کی وجہ سے لکھے ہیں اور کچھ اور لڑکیوں کی وجہ سے بھی- اس سے پہلے ایک کتاب دلی کے نام معنون کر چکے تھے- "دلی کے نام جو مٹ سکتی ہے مر نہیں سکتی" میراجی- ایم-اے لطیف بی-اے کے ساتھ فلم کمپنی کے سلسلے میں ہمیشہ کے لئے دلی کو خیرباد کہہ گئے- دلی سے اپنے اس جاں نثار

کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ ہوسکا اور دلی کی حالت بگڑنی شروع ہوئی مجھ سے دتی کا مٹنا نہ دیکھا جا سکا۔ مادر وطن کی لاش کو سسکتا چھوڑ کر میراجی کے وطن آگیا مجھے یقین ہے کہ دتی کی بدحالی کی خبر سن کر جتنی میراجی کو اذیت ہوئی ہوگی سی دتی والے کو بھی نہیں ہو سکتی۔ میراجی کے وطن پہنچ کر اتفاق سے میری ملاقات ایک ڈاکٹر صاحب سے ہوئی۔ ان ڈاکٹر صاحب کا نام اے۔ ڈی فرزدق ہے۔ یہ اچھرے میں "ہومیوپیتھک" علاج کرتے ہیں۔ میں نے انھیں مریضوں سے ذرا پنجابی لہجے میں اُردو بولتے دیکھ کر پوچھا آپ پنجابی کیوں نہیں بولتے؟ ڈاکٹر اے ڈی فرزدق نے جواب دیا میں اپنے ایک دوست کی یاد میں اردو بولتا ہوں۔ میرے وہ دوست بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔ انھیں اردو سے عشق تھا۔ آج کل شاید وہ بمبئی میں ہیں۔ بہت عرصے وہ دتی میں رہے پھر کسی فلم کمپنی کے سلسلے میں آگرہ چلے گئے۔ آگرہ میں کچھ کام نہ بنا تو لکھنؤ جا کر فلم کمپنی کو جمانے کی کوشش کی آخر بمبئی پہنچے مجھ سے وہ اکثر اردو بولنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ میرا ماتھا فوراً ٹھنکا۔ میں نے پوچھا آپ کے ان دوست کا نام کیا ہے ڈاکٹر صاحب نے بتایا ـــ میں انھیں شروع ہی سے ثنا صاحب کہتا ہوں لیکن اور لوگ ان کو میراجی کے نام سے جانتے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ سے ان کی دوستی کیسے ہوئی۔ ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزدق نے جواب دیا۔ ہم مزنگ کے ایک سکول میں آٹھویں سے دسویں جماعت تک ساتھ پڑھے۔ ثنا صاحب میٹرک میں فیل ہو گئے کیونکہ ان کا کورس کی کتابوں میں جی نہیں لگتا تھا۔ اور میں پاس ہو کر ایف سی کالج میں داخل ہو گیا ثنا صاحب مجھ سے ملنے کے لئے کالج میں آتے اور مجھے افسانہ نویسی کی تلقین کرتے ان کا خیال تھا مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ ثنا صاحب جب آٹھویں جماعت

میں تھے تو اتنے عمدہ مضامین لکھتے تھے کہ استاد اور لڑکے سب دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کے ہر مضمون میں دنیا سے انوکھی کوئی بات ضرور ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے نام کے ساتھ "صاحب" کا لفظ استعمال ہوتا تھا ورنہ اس عمر کے اور لڑکوں کو کوئی صاحب کے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ سارا اسکول اس زمانے میں ان کے اچھوتے پن کی وجہ سے ان کا شیدائی تھا۔

کالج میں میری ایک ہم جماعت تھی "میرا سین" اس لڑکی کا نام تھا اور میرا نام چونکہ "اے" سے شروع ہوتا ہے اس لئے لڑکیوں کے بعد سب سے پہلے حروف ابجد کے حساب سے میں ہی بیٹھتا تھا۔ اس زمانے میں ایف بی کالج میں نشست کا طریقہ ایسا ہی تھا۔ اتفاق سے میری اور "میرا سین" کی سیٹ برابر برابر تھی۔ کچھ عرصے بعد میرا جی میری طرف اپنے سکول کے اور ساتھیوں کی نسبت زیادہ ملتفت رہنے لگے۔ انھیں میری ہم نشیں میرا سین سے کچھ موالست ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ثنا صاحب نے بال بڑھانے شروع کر دیے بال بڑھانے کی وجہ میرا جی یہ بتاتے کہ مقابلہ ان کا کسی "بالوں والی" سے ہے۔ ثنا صاحب اور میں اکثر ساتھ سینما دیکھتے کیونکہ انگریزی فلم دیکھنے کا مجھے بھی شوق تھا اور ثنا صاحب کو بھی۔ کبھی کبھی ہم اردو کے فلم بھی دیکھتے۔ ثنا صاحب مجھے اکثر افسانوں کے پلاٹ بتاتے۔ مجھ سے اصرار کر کے لکھواتے اور پھر خود ہی کتر بیونت کر کے چھپنے کے لئے بھیج دیتے۔ دیکھتے دیکھتے ثنا صاحب نے میرا سین کا اتنا اثر قبول کیا کہ خود اپنا نام اس کے نام پر میرا جی رکھ لیا۔ ثنا صاحب روزانہ کوئی بیس پچیس قدم کے فاصلے سے میرا سین کے پیچھے پیچھے چلتے اور گھر سے کالج تک اور کالج سے گھر تک اسے پہنچا کر دم لیتے۔ جس کی خود میرا سین کو آخیر دم تک خبر نہ ہو سکی ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزوق نے کہا۔ اس لڑکی کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔

اور شاید یہی آن میراجی کی ثنا صاحب کو بھا گئی تھی۔ باقی وقت ثنا صاحب لائبریریوں میں کتابیں پڑھنے اور دوستوں سے ملنے جلنے میں گذارتے اور مختلف اخباروں اور رسالوں کے لئے کچھ لکھتے۔ رفتہ رفتہ انھیں اپنے سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ مہینوں نہ نہاتے نہ کپڑے بدلتے اور نہ حجامت بنواتے۔ ان کی مسیں بھیگ چلی تھیں۔ ثنا صاحب کے لئے جوانی اور محبت کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا یکایک ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزوق کو خیال آیا کہ وہ ایک اجنبی سے اپنے ایک دوست کے راز بلا وجہ کہے دے رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی اس کیفیت کو محسوس کیا اور کہا میں اجنبی نہیں ہوں اور میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر اے۔ ڈی فرزوق مارے خوشی کے مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوتے بچے اور اپنے اس جذبے کو کچھ ضبط کر کے بولے۔ لیکن آپ یہاں آئے کیسے! میں نے کہا۔ اس شہر میں ـــــ اس لئے آیا ہوں کہ مجھ سے میراجی کی دلّی کا لٹنا نہ دیکھا جا سکا وہ دن ہے اور آج کا دن۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے اس طرح ملتے ہیں جیسے ساتھ کے کھیلے ہوئے۔ اب میں میراجی کے دیس میں ہوں۔ ایس۔ ایس۔ ایس ٹھاکر اور اسلام الدین دلّی ہی کی لاش کی رکھوالی کر رہے ہیں کہ کب میراجی کی محبوب دلّی پھر سانس لینے لگے۔ ایم۔ اے لطیف بی۔ اے شاید لکھنؤ میں ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ لکھنؤ جس کے بارے میں کچھ عرصہ ہوا جوش ملیح آبادی نے یہ قطعہ کہا۔

جلتی ہوئی شمعوں کے بجھانے والے   جینا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے

لاشِ دہلی پہ لکھنؤ نے یہ کہا!   اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

اور میراجی ـــــ کون جانے وہ اب کہاں ہیں ـــ!

اخباروں میں جو کچھ چھپا ہے میراجی نہیں چاہتا کہ اس کا یقین کروں ـــ!

(ماہنامہ نفسیاتی جائزے جنوری سنہ ۱۹۵۰ء)

ردّی کے بھاؤ

یوں رونے کو حضرت یعقوبؑ سے لے کر بھگت کبیر اور میر تقی میر تک روئے۔
لیکن جنھوں نے اپنی آنکھوں میرا جی کو روتے دیکھا ہے وہ یہی کہیں گے کہ ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

حضرت یعقوب اپنے بیٹے کے لئے روئے، میر تقی میر دوسروں کے یوسف ثانی صفت بیٹوں کے لئے اور بھگت کبیر کبھی اس وجہ سے کہ چلتی کو گاڑی کیوں کہا جاتا ہے اور کبھی اس کارن کہ رنگی کو نارنگی کیوں کہتے ہیں، پر میرا جی کے رونے کی نوعیت ان بزرگوں سے مختلف تھی ـــــ وہ کبھی اپنی بیٹی کے نہ ہونے پر روتے، کبھی دوسروں کی بیٹیوں کے ہونے پر، اور کبھی کبھی اپنے اُس بھائی کی نادانی پر جس نے ان کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام ردّی کے حساب ٘وں بیچ دیا ـــ بھائی چاہے یوسف کے ہوں، میرا جی کے ہوں "بھائیوں کی دوکان" والوں کے ہوں یا میرے آپ کے ـــــ تقریباً ایک ہی برادری سے متعلق رکھتے ہیں۔

صنف نازک نے میرا جی سے اس درجہ اجتناب برتا کہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ موت، جو باعتبار صیغہ جنس لطیف ہے میرا جی تک کیسے پہنچ پائی لیکن پورا ایک برس ہونے کو آیا کسی نے اُس خبر وحشت اثر کی تردید نہ کی جو میرا جی کے بارے میں ۳ نومبر ۱۹۴۹ء

کے اخبارات میں شائع ہوئی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میراجی کا وہ غیر مطبوعہ کلام جو میرے پاس سے دلّی میں غدر ۴۷ء کی بھینٹ چڑھا اور جس کا کفارہ میں تا زیست ادا نہیں کر سکتا۔ میرے حساب سے اس سے کہیں زیادہ قیمتی تھا جو ان کے بھائی نے لاہور کے کسی دوکاندار کے ہاتھ ردی میں بیچا۔ کیونکہ جو مسودات میراجی کے بھائی کے ہاتھ پڑے وہ زیادہ تر ان کی غیر مطبوعہ نظموں پر مشتمل تھے لیکن میرے پاس ان کی غزلیں اور نثر کے ٹکڑے تھے ـــ کون جانے کس "بھائی" نے کس "بھائی" کے ہاتھ کس بھاؤ یہ خزانہ لٹا دیا۔

میں ذاتی طور پر کبھی بھی میراجی کی نظم کا اتنا دلدادہ نہیں، جتنا اُن کی نثر کا۔ اور نثر میں بھی تنقید ـــ اُردو ادب میں جتنی بے لاگ تنقید میراجی کے ہاں ملتی ہے اس کی مثال اردو کے اور نقادوں میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک ان کی غیر معمولی ذہانت اور دیانت اور دوسرے ان کا ہر موضوع پر گہرا اور ٹھوس مطالعہ۔ جب غزل لکھنے پر آتے تو کچھ میر کا سا انداز اختیار کرتے اور ایسا ٹھکا ہوا شعر کہتے کہ بڑے بڑے کہنہ مشق غزل گو انگشت بدنداں رہ جاتے۔ میر کو غالب کی طرح میراجی نے بھی مانا ہے۔ کیفیت کے عالم میں کبھی کبھی میر کی یہ غزل میراجی بہت جھوم جھوم کر گنگناتے ؎

غنچہ غنچہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے غدر کے درمیان کی دلّی میں ایک رات ایک میکدے میں ایسی بحث چھڑی اور بات یہاں تک بڑھی کہ میراجی کو حکم بنانا پڑا۔ جھگڑا یہ تھا کہ

شیفتہ میر کے زمانے میں تھے یا غالب کے دور میں۔ میراجی نے وہ فیصلہ سنایا کہ سارے میکش قائل ہو کر رہ گئے اور فریقین میں سے کسی کی بات نیچی نہ ہوئی۔ میراجی نے حکم لگایا کہ شیفتہ میر کے زمانے میں بھی تھے اور غالب کے دور میں بھی اور سند میں یہ شعر پڑھا ؎

شیفتہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اور پھر اس بحر میں وہ معرکۃ الآرا غزل کہی جس کی صحیح داد لکھنؤ کے رفیع احمد خاں مرحوم ہی دے سکتے تھے معلوم نہیں اب وہ غزل کس "بھائی" نے کیا کی۔۔۔؟!

دلی میں میراجی کے ہم مشربوں میں ایک صاحب تھے اسلام الدین۔ اسلام الدین صاحب میراجی سے کچھ اس نوع کا جارحانہ خلوص برتتے تھے کہ میراجی اسلام الدین صاحب کو "بھائی" کہنے لگے تھے۔ جو ریڈیو کے مشہور اداکار محمد حسین کے لاڈ میں نام لینے کی وجہ سے کچھ لوگوں میں صرف "پائی" ہو کر رہ گئے تھے۔۔۔ "بھائی یا پائی" کہتے تھے کہ میراجی یہ کیوں روتے ہیں کہ ان کے بھائی نے ان کے کلام کو ردی سمجھا جبکہ یہ خود اپنے کلام کو جان بوجھ پبلشروں کے ہاتھ ردی کے داموں فروخت کر آتے ہیں۔ بھائی اسلام الدین چاہتے تھے کہ پبلشروں میں میراجی کے مسودات کی فروخت ان کی معرفت طے پائے لیکن میراجی یہ کام براہ راست کر گذرتے تھے۔ بھائی اسلام الدین میراجی کی نجی زندگی کو بھی سنوارنے کے درپے رہتے۔ بھائی کو زعم تھا کہ چونکہ انھوں نے دیہات سدھار کے کام میں عمر بتائی ہے اس لئے میراجی کو بھی ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ کچھ تعجب نہیں کہ اب کے جب یہ لاہور جائیں تو ان کے بھائی خود انھیں ردی کی قیمت پر بیچ ڈالیں۔ لیکن میراجی کا عذر یہ تھا کہ میں چونکہ "دیہات" نہیں ہوں اس لئے "بھائی" کو میری نجی زندگی

سدھارنے کا کوئی حق نہیں۔ بھائی اسلام الدین کے اس عزم نے ایک دن یہاں تک رنگ دکھایا کہ میراجی ایک صبح خون میں رنگے ہوئے نظر آئے شبہ کرنے والے آج تک یہی شبہ کرتے ہیں کہ یہ بھائی کی دیہات سدھار کی کوشش تھی لیکن اس واقعہ کی تحقیق نہ ہوسکی اور تحقیق میں سب سے زیادہ حارج غالب کا یہ شعر تھا جس کا برعکس عکس اسی صبح میراجی کی مضروب پیشانی پر دیکھا گیا۔ شعر یہ تھا ؎

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

اس شعر پر میراجی کے ہاتھ کا الٹا "اوم" کا نشان بھی تھا جس سے شک ہوتا تھا کہ یہ سارا کارنامہ خودکردہ ہے لیکن میراجی کہتے تھے یہ میرا خط نہیں۔ ایس۔ ایس ایس ٹھاکر اور ایم اے لطیف بی۔ اے کا گمان تھا کہ یہ خودکشی کی کوشش ہے۔ مرنے سے پہلے یہ شعر لکھ کر اپنے ماتھے پر چسپاں کیا ہوگا جس کا الٹا ہم دیکھ رہے ہیں وغیرہ۔ واقعہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن نہ بھائی یا پائی" کا خلوص اور نہ دلی کے تمام دوستوں کے مشورے میراجی کو اپنا کلام خود ردی کے مولوں بیچنے سے باز رکھ سکے اور نہ بعض پبلشر میراجی کے فطری لاابالی پن سے فائدہ اٹھانے سے چوکے۔

ن۔م راشد کے ایران جانے کے بعد جب میراجی نے شدت کے ساتھ اپنے تئیں دلی میں تنہا محسوس کیا اور شادی اور خودکشی کے لئے بچوں کی طرح مچلنا شروع کیا تو میراجی کو ان دونوں ہلاکت آفرینیوں سے محفوظ رکھنے میں "بھائی" ہی پیش پیش تھے۔ بھائی اسلام الدین کہتے تھے خودکشی چاہے یہ کرلیں لیکن شادی میں انھیں ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ آخر راشد صاحب کو بھی منھ دکھانا ہے وہ کہیں گے نہیں کہ میرے پیچھے یہاں کے لوگوں نے جیتے جی میراجی

کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

میراجی نہ اس طرح کا خلوص کسی کے ساتھ برتتے تھے کہ بھائی معلوم ہونے لگیں اور نہ یہ گوارا کرتے تھے کہ ان کے ساتھ "دوست" بھائیوں کا سا سلوک روا رکھیں لیکن اب جب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ میراجی کے سب دوست قدرداں اور بھائی چاہے وہ بمبئی میں ہوں، دلّی میں ہوں، لاہور میں یا سمرقند و بخارا میں۔ ان بے اعتنائیوں کا حتی المقدور ازالہ کریں جو زندگی بھر ان کے ساتھ روا رکھی گئیں۔ سب سے پہلا فرض اس سلسلے میں اراکین حلقہ، ارباب ذوق کا ہے۔ جس کی بنیاد آج سے تقریباً بارہ برس پہلے میراجی نے لاہور میں رکھی کہ میراجی کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو ردّی کی ذلت سے نکالیں۔ دس فروری ۱۹۵۰ء کو میں لاہور پہنچا اور تادم تحریر لاہور میں اس کوشش میں ہوں کہ کسی طرح اُس ردّی کا کچھ کھوج لگ سکے جس کے لئے میراجی اکثر روئے ہیں اور میری یہ کوشش بالکل رائگاں نہیں گئی۔ آخر ایک پرزہ مزنگ کے ایک دوکاندار کے ہاں سے مجھے مل ہی گیا۔ مزنگ لاہور کے اُس مقدس محلے کا نام ہے جہاں میراجی رہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کاغذ کا پرزہ اس ڈھائی تین برس کی محنت کی کچھ کم قیمت نہیں ہے۔ دوستوں اور بھائیوں کی ترغیب کے لئے میں اس کاغذ کے ٹکڑے کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کاغذ کا اوپر کا ایک کونا پھٹ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے دیوناگری رسم الخط میں "اُوم" کی علامت صرف آدھی پڑھی جاتی ہے اور پہلی سطر کے شروع کے تقریباً دو تین لفظ بھی اُڑ گئے ہیں۔ نثر کا یہ ٹکڑا یہاں سے صاف پڑھا جاتا ہے:۔

"چپکے سے جا کر تیرے پہنے ہوئے کپڑے، جو تو نے ابھی ابھی اُتارے ہوں چرا لاؤں اور اپنے گھر کی خلوت میں انھیں دیکھ دیکھ کر، انھیں اپنے سینے سے لپٹا لپٹا کر ان سے

اپنے گالوں کو سہلا کر تسکین حاصل کروں۔ ان میں رچی ہوئی ترے جسم کی خوشبو مجھے لاکھوں شرابوں سے کہیں بڑھ کر مست کر سکتی ہے اور ترے جسم کی ساخت سے جو سلوٹیں ان میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کے مقابل سمندر کی لہریں، گھٹاؤں کی گدراہٹ کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ خوبصورت لڑکی! میرے خیالات ایک مرکز پر جمع ہو کر دن بدن دل کی بے قراری زیادہ کئے دیتے ہیں۔ وہی سادہ آرزوئیں، جو ازل سے انسان کے خون میں ڈال دی گئی ہیں۔ تہذیب و تمدن کے اثرات کے ماتحت ذرا سے اختلاف کے ساتھ میرے دل میں بھی تیرے لئے ہیں۔ اور ایسی ہی آرزوئیں تیرے دل میں بھی ہوں گی کہ تو بھی جوان ہے اور میں دل پسند ـــــ میری نازنین ـ ـ! اپنے اور میرے دونوں جسموں کو ملا کر اس ابدی راستے پر گامزن ہو جو اس قدر پریشان نظری کے باوجود ذہن و روح انسانی کا واحد مقصد ہے۔ اگر بیرونی بندھن نہیں توڑ سکتی تو اندرونی رکاوٹیں ہی دور کر دے کہ باقی کام میرا ہے۔"

اس کی پشت پر انگریزی کی چھ سات سطریں رقم ہیں جن کا ترجمہ کچھ اس طرح سے ہو سکتا ہے۔

ترد منت نئی دیویوں کی پوجا کرتے ہیں اور عورتیں جھوٹے دیوتاؤں کے پیچھے بھٹکتی ہیں ـــــ اور دیوتاؤں کے انبار اور بھی ہیں۔"

دیوناگری رسم الخط میں ت اوم کی علامت اس انگریزی عبارت پر بھی ہے۔ اس کے نیچے پنسل سے غالب کے اس شعر کی تقطیع کی ہے۔ شعر یہ ہے۔

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب ۔۔۔ تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

مفتعلن مفتعلن مفتعلن فع

اس کے علاوہ کاغذ کے اس ٹکڑے پر پنسل سے کچھ الفاظ ایسے لکھے ہوئے ملتے ہیں جنھیں پڑھنا دشوار ہے۔ کیونکہ انھیں پنسل کی ٹوٹی ہوئی نوک سے خوب گھس کر کاٹ دیا گیا ہے۔ صرف ایک طرف اتنا اب بھی پڑھا جا سکتا ہے:-

"نصراللہ خاں عزیز ہے" اور "سنگ ریزوں کی طرح"

اس تقریباً ایک فٹ لمبے اور چھ انچ چوڑے ملگجے کاغذ پر جو میراجی کے ہاتھ لگنے یا ردی میں بکنے سے پہلے شاید اتنا مسلا ہوا نہ ہوگا کہیں میراجی کے دستخط نہیں ہیں۔ حالانکہ میرے علم میں چاہے وہ شراب یا آنسوؤں میں غرق ہی کیوں نہ ہوتے کبھی اپنی تحریر کی اس وضعداری میں فرق نہ آنے دیتے۔

کاغذ تو کاغذ انھوں نے ایک دفعہ میرے سامنے آموں تک پر "ادم" لکھا اور دستخط کئے۔

ایک مرتبہ جب ایک خاص کیفیت میں میراجی شراب اور آموں کی نذر چڑھانے غالب کے مزار پر گئے تو کہا کہ آپ کا مزار اب تک بغیر چھت کے پڑا ہے۔ اور "دلی کے چندہ ماموں" جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آپ کا مزار درست کرانے کے لئے ۱۷ ہزار روپے چندہ جمع کیا۔ اسی قبیل کے بہت سے چندوں کی بدولت بہترین چھت کے نیچے "خانقاہانہ" عیاشیوں میں مصروف ہیں۔ ایس۔ ایس ٹھاکر کا خیال ہے کہ ۱۷ کا عدد منحوس ہوتا ہے کیونکہ اس کا حاصل جمع آٹھ ہے۔ اگر تھری ایس ٹھاکر" کے جذبات کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو میں یہ سترہ ہزار کی رقم چندا ماموں سے چھین کر آپ کے مزار کی اتنی وسیع چھت تعمیر کراتا جس کے نیچے میں بھی سو سکتا کیونکہ میں بھی آپ کی طرح ایک بنگالن "میراسین" کا پجاری ہوں ـــ آپ نے کہیں اپنی بنگالن محبوبہ کا بالمشافہ ذکر نہیں کیا لیکن میرے لئے آپ کے اس شعر میں کافی اشارہ موجود ہے کہ

کلکتے کا جو نام لیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ اور پھر بنگال کے جادو سے تو نہ آپ بچ سکے اور نہ میں ویسے مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے میرے بہت سے مضمون چرا کر اپنے اشعار میں باندھے ہیں اور میں یہ بھید کسی پر اس لئے نہیں کھولتا کہ آپ اور میں دونوں بنگال کے حسن اور شراب کی سرمستی کا شکار رہیں۔ لیجئے آم کھائیے ؎

آم کے آگے پیش جائے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور

اور اگر آپ چاہیں تو شراب بھی حاضر ہے۔ انگور کی بیٹی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ انگور تک کے ہاں بیٹی ہوئی لیکن میں اس نعمت سے محروم ہی رہا۔ اجنبیوں کی بیٹیوں سے فیض نہ پہنچا تو اپنی ہی کوئی بیٹی ہوتی — اور پھر میرا جی اپنی بیٹی کے نہ ہونے پر بے طرح روئے۔ دیر تک اس غم میں روتے رہے اور انگور کی بیٹی سے التفات برتتے رہے۔ یہاں تک کہ صرف آم باقی بچے اور میرا جی نے ہر آم پر "ادم" لکھ کر دستخط کئے اور مرزا صاحب کے سرہانے رکھ کر چلے آئے۔

اس سے پہلے کہ میرا جی کے لئے بھی کوئی "دلی" والے "چندہ ماموں" پیدا ہوں ہمارا فرض ہے کہ ان کی کوئی ٹھوس یادگار قائم کر جائیں جو ان کے چالیس سال کے گریۂ پیہم کی کسی نہ کسی حد تک تلافی کر سکے کم سے کم انھیں ردی کی اس لعنت سے تو نکالیں جس میں بھائی اسلام الدین کے کہنے کے مطابق خود میرا جی نے اور بقول میرا جی ان کے بھائی نے انھیں پہنچایا ——— ورنہ ———

حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

(ماہنامہ "نقوش"، دسمبر ۱۹۵۰ء)

اناؤنسر

کہنے کو اناؤنسر نشریات کے سلسلے کی وہ اہم کڑی ہے جس کے بغیر ریڈیو کا کوئی پروگرام آپ کے ریڈیو سیٹ تک پہنچ ہی نہیں سکتا لیکن اگر اناؤنسر کی سنئے تو یہی کہیے

یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

ایسے ایسے سرد و گرم سے ہر لمحے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔ پہلے موسم ہی کو لیجئے کہ بات یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ شاید ہی کوئی شخص دنیا میں موسم کا ہر وقت اتنا خیال رکھتا ہو جتنا اناؤنسر غریب کو رکھنا پڑتا ہے۔ وجہ یہ کہ آندھی چاہے بیٹھ جائے، برف پڑتی ہو یا آگ برس رہی ہو، اناؤنسر کو وقت سے آدھ گھنٹے پہلے اسٹوڈیو پہنچنا ہے۔ شہر میں کتنا ہی بڑا ہنگامہ ہو اور کسی قسم کا انھیں کچھ دامن بچا کر گذر جانے ہی میں لطف آتا ہے۔ اپنی آنکھیں ہر میلے ٹھیلے تیج تہوار سے بند رکھنی پڑتی ہیں۔

ہوائی جہاز ایک منٹ دیر میں اڑ سکتا ہے۔ ریل گاڑی دو منٹ بعد پہنچ سکتی ہے لیکن ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام اگر بجلی کی رَو ٹھیک کام کر رہی ہے تو ایک سکنڈ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ اناؤنسر اگر کبھی کسی چیز میں دلچسپی لیتا بھی ہے تو صرف اس وقت جب آپ آنکھوں دیکھی سنیں اور اس میں بھی بعض اوقات اسے کہنے کا کام

زیادہ کرنا پڑتا ہے اور دیکھنے کا کم۔ اور پھر صاحب کیسے کیسے وقت اناؤنسر بڑبڑاتے ہیں کہ آپ سنیں تو عش عش کریں۔ بشرطیکہ آپ سنتے ہوں کیونکہ بالعموم اندازہ یہی ہے کہ اناؤنسر صاحبان جتنی توجہ بولنے میں صرف کرتے ہیں اس توجہ کا عشر عشیر بھی سامعین انھیں نہیں دیتے۔ شاید اسی لئے بہت سے سننے والوں کا خیال ہے کہ ہر ریڈیو اسٹیشن پر ایک ہی اناؤنسر ہوتا ہے جو ہر وقت بڑبڑاتا رہتا ہے، حالانکہ واقعہ کسی حد تک اس کے برعکس ہے۔

ہر ریڈیو اسٹیشن پر وہاں کے پروگراموں اور اوقات کے تناسب سے اناؤنسر بدلتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک اناؤنسر سے کہا گیا، چلو فلاں ورک شاپ میں اور "چشم دید حالات" بیان کرو۔ اس سے پہلے کہ اناؤنسر کچھ ہاں، نا کر سکے، اسے ریڈیو کی گاڑی میں بھر کر اس خاص ورک شاپ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اناؤنسر صاحب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ——— مشینوں کی ایک دنیا ہے۔ مختلف قسم کی مشینیں قسم قسم کے کام انجام دے رہی ہیں ——— اب کیا کریں، آخر کیا کہنا شروع کریں لیکن صاحب وہ اناؤنسر ہی کیا جو خاموش رہے چنانچہ انھوں نے بولنا یا بقول بعض سامعین کے بڑبڑانا شروع کیا۔ شروع شروع کے تو کچھ لگے بندھے فقرے ہوتے ہی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے حواس مجتمع کئے اور مختلف کاریگروں سے لے کر "مشین مینوں" اور چھوٹے بڑے انجینئروں تک سے ایک طرح کا انٹرویو شروع کر دیا۔ ورک شاپ کے کارندوں نے فر فر مختلف مشینوں کے نام اور کام گنانے شروع کئے۔ جہاں وہ ذرا اٹکیں یا ہچکچائیں، اناؤنسر صاحب خود بولنا شروع کر دیں ——— ایسے موقعوں پر سامعین تو اپنے ریڈیو سیٹ کے قریب بیٹھے گویا کانوں سے سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں

لیکن اناؤنسر کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی بات موقع اور مصلحت کے خلاف نشر ہو جائے۔ کوئی بے ضرورت جملہ نہ ہو۔ زیادہ لفاظی نہ سمجھی جائے زیادہ سے زیادہ معلومات سننے والوں کو بہم پہنچائی جائیں اور پھر یہ کہ وقت کم نہ رہ جائے زیادہ نہ ہو جائے۔ یہ اور اسی قسم کی دسیوں ذمہ داریاں ایسے مقامات پر اناؤنسر کا دماغ پلپلا کر کے رکھ دیتی ہیں۔

یہیں لاہور کا ذکر ہے ایک مشاعرے کا "ٹیلے" تھا جن صاحب کو صدارت کرنی تھی وہ کسی وجہ سے عین وقت پر نہ پہنچ سکے چنانچہ ایک اور بزرگوار سے درخواست کی گئی کہ وہ صدارت کے فرائض انجام دیں۔ یہاں تک تو چلئے کوئی بات نہیں لیکن اناؤنسر کی جان کنی اس وقت دیکھنے کے لائق تھی جب کچھ دیر بعد صدر مذکور بھی تشریف لے آئے اصولاً اس مشاعرے کی صدارت انھیں کو کرنی تھی۔ اور اخلاقاً صدارت کے فرائض دوسرے صاحب انجام دے رہے تھے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک مشاعرے کے دو صدر ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ صدر کی تبدیلی کیسے کی جائے اور سب کچھ ایک ہی لمحے میں سوچنا تھا۔ چنانچہ اناؤنسر نے کہا ـــــ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس مشاعرے کی صدارت کا بوجھ ایک جواں سال شاعر کے کندھوں کو اٹھانا تھا۔ بزرگ محترم نے اس کا بار جتنی دیر تک سنبھالا اس کے لئے ان کا ممنون ہونا چاہئے۔ فلاں صاحب چونکہ تشریف لے آئے ہیں اس لئے اب اُن سے درخواست کی جاتی ہے کہ کرسی صدارت کو خود رونق بخشیں"۔ ہو سکتا ہے یہ سن کر آپ اس نتیجے پر پہنچے ہوں کہ یہی بات اس سے زیادہ مناسب الفاظ میں بھی کہی جا سکتی تھی لیکن آپ ذرا اس لمحے کی نزاکت کا اندازہ کر کے دیکھئے اور سوچئے کہ وقت کے وقت صرف اس قدر کہہ دینا کتنا دشوار تھا۔

آپ کہیں گے مگر ایسے مواقع تو شاذ ہی آتے ہیں ـــ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ اناؤنسر
کی دو ٹر ریڈیو اسٹیشن، تو یہاں کی بھی سن لیجیے کہ کیسا کیسا حاضر دماغی سے کام لینا پڑتا ہے
آپ ایک اعلان سنتے ہیں کہ فلاں صاحب سے فلاں راگ سنیئے۔ اس آسانی کے پس منظر
میں کیسے کیسے سخت مقام آتے ہیں، یہ کوئی اناؤنسر ہی کے دل سے پوچھے۔ پہلی بات تو
یہ کہ فلاں صاحب تشریف بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر تشریف فرما ہیں تو کیا اسی اسٹوڈیو
میں ہیں جہاں انھیں اصولاً ہونا چاہیئے یا کسی دوسرے اسٹوڈیو میں! اب اگر وہ کسی غلط فہمی
کی بنا پر دوسرے اسٹوڈیو میں ہیں تو انھیں اصل اسٹوڈیو تک پہنچانا اپنی جگہ اچھا خاصا مرحلہ ہے
پہلے تو وہ کہیں گے "بس ساب اپن تو یہیں ٹھیک ہیں۔ ٹھاٹ جم گیا ہے۔
تانپورے مل چکے ہیں۔ کون اٹھتا پھرے۔ اس وقت اگر ان سے کہہ دیا جائے جی نہیں
یہاں سے آپ کا پروگرام نہیں ہو سکتا تو وہ جواب دیں گے السلام علیکم۔ کوئی اور انتظام
کر لیجیئے "اپن چلے۔ چنانچہ کہا یوں جاتا ہے کہ خاں صاحب یوں تو آپ جہاں بھی گائیں گے
باغ لگ جائے گا لیکن وہ اسٹوڈیو آپ کے لیے مخصوص ہے۔ اور پھر اس وقت اس
اسٹوڈیو کی وہ تعریف کرنی پڑتی ہے جو خاں صاحب کو پسند ہو لیجیئے بہ مشکل تمام وہ اپنے
اسٹوڈیو میں پہنچ گئے۔ پھر پوچھا جاتا ہے کہ خاں صاحب آپ جو درباری گا رہے ہیں اس کے
بول کیا ہیں ٹھکے اور تال کیا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ درباری ہیں اس وقت جی نہیں
لگ رہا ہے مالکوس کا خیال ہے۔ پھر اناؤنسر کو یوں لسانی کرنی پڑتی ہے کہ سبحان اللہ!
مالکوس کی کیا بات ہے اور آپ کے منھ سے، سونے پہ سہاگا، لیکن خاں صاحب ایک
دنیا اس وقت آپ سے درباری سننے کی متوقع ہے ویسے جو آپ چاہیں۔ خدا خدا کر کے
کفر ٹوٹتا ہے اور خاں صاحب درباری پر جم جاتے ہیں۔ اب بولوں کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے

کبھی کسی زبان کے بول بتاتے ہیں اور کبھی کسی زبان کے۔ جب سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے اور اناؤنسر وقت مقررہ پر اعلان کرنے بیٹھتا ہے تو خاں صاحب پھر وہی پرانا راگ الاپنے کی فکر میں نظر آتے ہیں اور وقت کے وقت اناؤنسر کو اشارہ کرتے ہیں کہ درباری میں جی نہیں لگتا مالکوس ہی رکھئے۔

اس لمحے میں کمال حاضر دماغی سے اناؤنسر کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ چھپے ہوئے پروگرام کی بجائے ریکارڈ لگانا شروع کر دے جو بالعموم ہنگامی حالات کے لئے اناؤنسر کی دسترس میں ہوتے ہیں یا پھر خاں صاحب کو ان کی مرضی کا راگ ہی گانے دے یہ لیجئے اناؤنسر بوتھ میں لال بتی جل گئی اور اعلان ہوا فلاں صاحب سے فلاں راگ سنئے۔ یا چھپے ہوئے پروگرام کی بجائے چند گراموفون ریکارڈ ملاحظہ کیجئے۔

اس کے بعد ایک دوسرے صاحب سے بات چیت یوں شروع ہوتی ہے۔ ویسے تو اس نیلی چھت کے نیچے ایک سے ایک صاحبِ کمال موجود ہے لیکن آپ کی کیا بات ہے وہ سُر آپ کو عطا ہوا ہے کہ کان پاک ہو جاتے ہیں "میاں" کی دین ہے اس میں کسی کا کچھ اجارہ تو ہے نہیں، اور پھر راگ کا مکھڑا جتنا صاف آپ کے ہاں دکھائی دیتا ہے ہم نے تو سنا نہیں۔ بھیرویں تو گویا آپ کے گھر کی لونڈی ہے۔ ہاتھ باندھے کھڑی ہے اور یوں اناؤنسر کبھی کبھی بھیرویں پر رضامند کرنے کے لئے خاں صاحب سے ہزار باتیں ملاتے ہیں۔

اور پھر یہی نہیں کہ صرف گانے والوں ہی کو سنبھالنا پڑے بلکہ سازندوں کی بھی کسی نہ کسی عنوان سے ناز برداری کرنی پڑتی ہے کچھ اس طرح کہ واہ خاں صاحب کیا ٹھیکا لگایا ہے بس سنگت کوئی آپ جیسی کرے۔ ایک ایک بول صاف گن لو کتنا شفاف

ہاتھ ہے جیسے کوئی موتی رول رہا ہو اور پھر اس پر یادداشت آپ کی سی۔ ریاض کا مزہ جب آتا ہے کہ حافظہ آپ کا پایا ہو کیا کیا ٹکڑے لگاتے ہیں آپ اور کیسی کیسی جگہ دیکھ کر طبلے کی جوڑی کو آپ کی ذات سے چار چاند لگ جاتے ہیں طبلے کی تعریف کے بعد دیکھا کہ سارنگی نواز صاحب منہ پھلائے بیٹھے ہیں۔ ان سے کچھ یوں مخاطب کرنا پڑتا ہے۔ سارنگی! ارے صاحب اسے تو سورنگی کہنا چاہئے۔ وہ باریکیاں ان تانت کے تاروں میں سے آپ ادا کرتے ہیں جو گلے سے ادا نہیں ہو سکتیں۔ سنگت کے لئے اس سے بہتر ساز ہی نہیں اور پھر آپ کا سا سبک ہاتھ۔ واہ واہ۔ اور ستار کو کیا کہئے۔ امیر خسرو نے گویا آپ ہی کے لئے یہ ساز ایجاد کیا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس!

یہ تو ہوا استادی موسیقی کا قصہ ۔ غزلوں اور گیتوں کا معاملہ جدا ہے۔ سب تو نہیں کچھ ایسے آرٹسٹوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے کہ انھیں دس دس مرتبہ بتا رہے ہیں کہ "دلِ حال یہ ہنسی" نہیں "حالِ دل پہ ہنسی"، مگر ان کی زبان پر جو چڑھ گیا جب گا میں گے تو وہی آگے آتی تھی دلِ حال پہ ہنسی"۔ اگر مصرعہ ہے

"بال کھولے تو گھٹا لوٹ گئی"

تو وہ سنا رہے ہیں "گھٹا لوٹ گئی"۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی گانے والا اپنی کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے ہانپتا کانپتا اسٹوڈیو میں وقت سے ایک دو منٹ پہلے پہنچا اور اس کے بجائے کسی دوسرے پروگرام کا انتظام کر لیا گیا۔ اناونسر صاحب اعلان کیا ہی چاہتے ہیں کہ گانے والے کی صورت نظر آئی۔ انھوں نے دور ہی سے اشارے سے پوچھا۔ فن کار کے منہ سے بوکھلاہٹ میں صرف اس قدر نکلا "گوئی صورت والی غزل" — اور اعلان ہوا۔

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

غالب کو کون نہیں جانتا۔ اُن کی ایک غزل، بہت سے شعرا کے پورے پورے دیوان پر بھاری ہے۔ غالب کا کلام بار بار سن کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اور اسی قسم کا کلام کاف یہاں تک باندھا کہ جیسے غزل گانی ہے کسی طرح گاتے وقت سامعین کو یہ محسوس نہ ہو سکے کہ اس کا سانس پھول رہا ہے۔ اور پھر یاد کیا کہ کیا کہہ گئے تھے"۔ "کوئی صورت" والی غزل۔ دل میں جلدی سے دونوں مصرعے سوچے اور مطلع پڑھا ؎

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

اناؤنسر کی اس طول کلامی سے کبھی کبھی سننے والے جھنجلا بھی اُٹھتے ہیں اور ان کا برافروختہ ہونا بھی ایک حد تک درست ہے۔ کیونکہ وہ پس منظر سے ناآشنا ہوتے ہیں ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

یوں تو ہر اعلان کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور وہ پہلے سے تیار بھی ہوتا ہے کیونکہ سارے پروگرام چھپے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان چھپے ہوئے پروگراموں کو جوں کا توں وقت مقررہ پر پیش کرنے میں اناؤنسر کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ شاید اب آپ کو ہو گیا ہو۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ دو پروگراموں کے درمیان اناؤنسر صاحب یا تو خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں یا سگریٹ بازی اور چائے نوشی میں وقت گنواتے ہیں۔ مگر واقعہ کچھ کچھ اس کے برعکس ہے۔ دو پروگراموں کے درمیان اناؤنسر کے دماغ پر یہ بوجھ رہتا ہے کہ جو پروگرام ہو رہا ہے وہ ایک سیکنڈ ادھر نیچے نہ ہو، دوسرا پروگرام اس اثناء میں تیار رہے۔ اگر ستار بج رہا ہے تو ستار کا تار نہ ٹوٹ جائے

گانے والے کے حلق میں پھندا نہ لگ جائے۔ کھانسی کا دورہ نہ پڑ جائے۔ کوئی تال بے تال نہ ہو وغیرہ۔ اگر ڈراما ہے تو پھر یہ خیال ہے کہ ڈرا وقت سے پہلے تو ختم نہیں ہوگا۔ بعد تک تو نہیں چلتا رہے گا۔ اسی طرح اگر تقریریں ہے تو، کہیں سے چشم دید حالات بیان ہو رہے ہوں تو، انھیں بر وقت ہنگامی حالات کے لئے چاق و چوبند رہنا پڑتا ہے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اناؤنسر ایک خاص قسم کی آواز کا نام ہے۔ اور بس انھیں نہیں معلوم کہ اناؤنسر کو آواز کے علاوہ حواس سے کس قدر کام لینا پڑتا ہے۔ ایک ہی سیکنڈ میں کسی بات کا قطعی فیصلہ کرنا اور پھر اس کے نتائج کے لئے تیار رہنا کیونکہ فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ آخر اناؤنسر بھی ایک نوع کا انسان ہی ہوتا ہے۔

اناؤنسر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے کبھی کسی بات پر غصہ نہ آئے، کسی حادثہ سے کبیدہ خاطر نہ ہو، زیادہ خوش بھی نہ رہے۔ بس کچھ معتدل سا مزاج رکھے۔ پروپیگنڈا، ادب، موسیقی وغیرہ سے اگر پوری واقفیت نہ ہو تو تھوڑا بہت مَس ضرور ہو۔ کم سے کم اتنا کہ وقت کے راگ سے واقف ہو۔ اگر غالبؔ اور مومنؔ کا نہیں تو کم از کم میرؔ اور امیرؔ مینائی کے کلام اور رنگ کا فرق جانتا ہو۔ اتنا کم علم نہ ہو کہ اگر کوئی صاحب نادانستگی میں اکبر الہ آبادی کی غزل کو نظیر اکبر آبادی کی غزل بتائیں تو اُسے فوراً شک نہ گزرے اور اس کی تصدیق کئے بغیر اعلان کر دے۔ لفظوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اس کے ذہن میں ہو۔ جس اناؤنسر کی طبیعت میں روانی اور مزاج میں سکون نہ ہو اسے کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔

اناؤنسر چاہے کتنی ہی عجلت میں اور کیسا ہی ہڑبڑایا ہوا کیوں نہ ہو لیکن سامعین کو حتی الامکان اس کا احساس نہیں ہونے دیتا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ کسی ہنگامی

حالت کا اثر اپنی آواز سے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔

سنا ہے اب سے دور۔ دوسری جنگ عظیم میں جب لندن پر بمباری ہو رہی تھی تو بین بی۔ بی۔ سی کے اسٹوڈیو پر ایک بم گر کر پھٹا۔ بم کچھ سیدھ باندھ کر وہاں نازل ہوا جہاں اناؤنسر خبریں پڑھ رہا تھا لیکن سامعین نے سوائے ایک دھماکے کے اور کوئی آواز نہ سنی۔ خبریں اسی طرح ہوتی رہیں۔ بعد میں لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس اسٹوڈیو کا اچھا خاصا حصہ منہدم ہو گیا تھا لیکن اناؤنسر کی تیوری پر بل نہ آیا اور خبریں ختم کر کے ہی دم لیا۔

یہ ہے "اناؤنسر" اب چاہے اسے آپ محض حیوان ناطق سمجھیے، اشرف المخلوقات یا کم سے کم اشرف النشریات!

(بہ اجازت ریڈیو پاکستان۔ لاہور)

(ماہنامہ "مخزن" مارچ ۱۹۵۱ء)

سر اُٹھایا تھا کہ "سنگ" یاد آیا

۲۹ ردسمبر ۱۹۵۱ء؛ ہفتے کی رات کو جب ریڈیو پر یہ خبر سنی کہ اردو کے مشہور شاعر حضرت نہال سیوہاروی کا کراچی میں انتقال ہو گیا تو جان نکل گئی ابراہیم سلیم صاحب اور میاں لطیف الرحمن صاحب جنھیں مارے مروت کے چچا لطیف کہا جاتا ہے، میری حالت دیکھ کر گھبرائے تو میں نے کہا کہ مجھے افسوس اس کا کم ہے کہ ع

اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

بلکہ دھچکا یہ لگا ہے کہ نہال کی عمر پچاس برس کی بتائی گئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس کے درمیان ہونی چاہیئے تھی۔ نہال کے ہر ہر شعر کے ہر ہر لفظ سے۔ جواں ہمتی تو رہی ایک طرف، جواں سالی برستی ہے۔ "چچا لطیف" نے کہا تو پھر یہ نہال صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کی تازگی کے باعث کسی کو اپنی پختہ سالی کا احساس نہ ہونے دیا۔

میں پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور جب سر اُٹھایا تو وہ پتھر یاد آیا جہاں ہر شب کتب خانہ علم و ادب کی محفل برخاست کرنے کے بعد کسی سے کدے یا قہوہ خانے میں مختلف موضوعات پر مباحثے یا کبھی کبھی حزامنہ کا بدلنے کے لئے "مفاحشے" کر کے دلی کے چند یاران علم و ادب یادگار رباغ کے دروازے کے باہر پتھر پر آ کر پھر جماتے اور جو بحثیں تشنہ رہ جاتیں انھیں

اپنی دانست میں گویا پایۂ تکمیل تک پہنچاتے اور اس وقت تک اس پتھر سے اُٹھنے کا نام نہ لیتے جب تک سپاہی آکر آوارہ گردی میں چالان کرنے کی دھمکی نہ دیتا۔ تابش صاحب کا خیال تھا کہ کوئی "پیر میکدہ" یا "میر قہوہ خانہ" وقت ختم ہو جانے کا عذر پیش نہ کرے اور کوئی پولیس کا سپاہی کہیں کسی حالت میں ہوں کبھی نہ ٹوکے اگر یہ نہال صاحب ذرا آدمیت کی جون میں رہیں۔ تابش اپنی ہی طرح انھیں باقاعدہ بنانے کی کوشش میں رہتے لیکن ان دونوں شاعروں میں وضع قطع کے اعتبار سے بقول ظفر قریشی کے "بُعد المقطبین" تھا۔ ایک طرف تابش کا یہ حال تھا کہ اگر ایک جوتا آج خرید لیے تو دس برس بعد وہی جوتا آپ کو آج سے زیادہ نیا معلوم ہوگا۔ شیروانی جیسی درزی نے سی کر دے دی، کیا مجال جو اس میں کہیں کوئی سلوٹ کبھی نظر آجائے۔ داغ دھبے کا تو ذکر ہی کیا۔ جو درزی ان کے کپڑے سیتے ہیں چاہے ان کے چہرے کی جھریوں میں کچھ بھی اضافہ کیوں نہ ہو جائے لیکن تابش دہلوی کے کپڑے سالہاسال بعد آپ کو ٹانکے کے ٹوٹے محسوس ہوں گے۔ پر نہال صاحب اس کے اُلٹ رہتے۔ گھر سے ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہن کر نکلتے لیکن جہاں پہنچتے دیکھنے والوں کو یوں نظر آتا جیسے یہ ہر گلی اور ہر بازار کو کوچۂ جاناں سمجھ کر سر کے بل گزرے ہیں۔ گرد و غبار میں اَٹے ہوئے۔ ہاتھ میں تین چار دو مرے جیل قسم کے قلم بٹیروں کی طرح دبائے جن کی نبوں کی نوکیں اس قدر "TECHNICOLOUR" رہتیں کہ یہ سمجھنا دشوار ہوتا کہ نہال صاحب آخر کس کس رنگ کی روشنائیوں کا استعمال کس کس نب سے کس کس وقت کرتے ہیں اور پھر جب کسی سے ان کا تعارف کرایا جاتا تو ہمیشہ بند کی بند مٹھی مع ان قلموں کے تعارف کرانے والے ہی کے ہاتھ میں دے دیتے۔ تعارف حاصل کرنے والا اس "بوقلمونی" پر دنگ رہ جاتا اور ہر چند تعارف کرانے والے کی کوشش یہ ہوتی کہ یہ کسی طرح اسی آدمی سے ہاتھ ملائیں جس سے تعارف کرایا جا رہا ہے لیکن نہال صاحب

اسے کچھ وضعداری سے بعید سمجھتے کہ جان پہچان کے آدمی کو چھوڑ کر کسی نئے آدمی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیں اور پھر روزمرہ کے ملنے جلنے والوں سے نئے سرے سے تعارف حاصل کر کے بقول شاہد صاحب کے "الٹی ہنسی" کچھ اس طرح ہنستے کہ نیا آدمی جس سے دراصل ان کا تعارف کرانا مقصود ہوتا "پسینہ پونچھتا اپنی جبیں سے"۔

شاہد صاحب کا خیال تھا کہ عام انسان جب قہقہہ لگاتے ہیں تو ان کی ہنسی حلق سے باہر کی طرف نکلتی ہے لیکن اس خاص انسان کی ہنسی واپس حلق ہی میں اُتر جاتی ہے اس لئے اس ہنسی کا نام انھوں نے "الٹی ہنسی" رکھا تھا۔ امیر حیدر صاحب کا خیال تھا کہ یہ داخلی ہنسی ہے اور ان کے نزدیک ہنسی کا یہ نوحہ محمد حسن عسکری صاحب کے الفاظ میں داخلی خارجیت یا خارجی داخلیت کا کرشمہ تھا۔

نہال کے جان پر کھیل جانے کی خبر سن کر سب سے زیادہ صدمہ تو ظاہر ہے جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کو ہوگا اور کوئی شعر و سخن کی محفل کہیں بھی اب ایسی منعقد نہ ہو سکے گی جہاں عبدالخالق نہال سیہواروی کی کمی محسوس نہ کی جائے لیکن دلّی کے وہ "یارانِ علم و ادب" جو "یادگار" کے باہر باغ کے دروازے کے پتھر پر بیٹھ کر نہال کی غزلیں سنتے تھے جس طرح ان کی عدم موجودگی پر متاسف ہوں گے وہ بیان سے باہر ہے۔

نہال صاحب کے بارے میں اکثر اسی سنگِ سرخ پر بیٹھ کر جو دلّی کے ایڈورڈ پارک یا یادگار باغ کے دروازے کے باہر نصب ہے، یہ بحث ہوتی کہ ان کا شمار نباتات میں کیا جائے، جمادات میں یا حیوانات میں ــــــ لیکن ان کی شاعری میں کبھی کسی کو کوئی کلام نہ ہوا۔ گو تخلص ان کا ہمیشہ معرضِ بحث میں آیا اور میجر محمد میاں جاذب قریشی دہلوی بی اے (آنرز)، ایل۔ ایل۔ بی تک نے ان کو تخلص بدلنے کی تلقین کی جن کے جاذب تخلص رکھنے پر

خود اپنی جگہ بعض "یارانِ علم و ادب" کچھ مطمئن نہ تھے لیکن نہال کے ہر ہر شعر پر ہمیشہ ہر سخن فہم کو داد ہی دینی پڑی۔ اور شاعرِ "شباب و انقلاب" نہال ہر محفل میں اپنی نغز گوئی کا سکہ جما کر اُٹھا۔ حضرت جگر مراد آبادی کو جہاں اس کا افسوس ہے کہ مجاز کو جوش نے بگاڑا۔ وہاں اس کی خوشی بھی ہے کہ نہال کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

اسی مہینے میں شان الحق صاحب حقی دہلوی کسی کام سے کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ ایک مخصوص محفل میں، جو ایک طرح سے ن۔ م راشد صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی، نہال صاحب اور حضرت ادیب سہارنپوری کا ذکر باتوں باتوں میں آگیا۔ "شان" صاحب نے کہا کہ نہال صاحب کی شاعری تو حسب معمول شباب پر ہے لیکن وہ خود کچھ مرجھا چلے ہیں میں نے کہا خیر اس کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاہد صاحب اس سلسلے میں دلی ہی میں ایک مرتبہ "ساقی" کے دفتر میں اطمینان دلا چکے تھے کہ نہال میں کوئی چیز اب مرنے کی باقی رہی ہی نہیں۔ جو چیزیں انسان میں مرنے کی ہوتی ہیں وہ سب ان میں پہلے ہی مر چکی ہیں اب یہ محض ایک روح ہیں اور روح بعض لوگوں کے نزدیک ہوتی ہے اور لازوال ہوتی ہے لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ خبر بھی ابھی سننے کو رکھی ہے ؎

اے زلیخا وہ رندِ شاہد باز!!

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام　　　خواب دکھلائے نادیدہ گلستانوں کے

جس غزل کا یہ شعر ہے، ساری غزل کچھ اسی "موڈ" میں ایک مرتبہ دلی میں صادق الخیری صاحب کے مکان پر ایک محفل میں جب نہال صاحب نے سنائی تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں یہ حضرت پٹڑی تو نہیں بدل رہے ہیں۔ میں نے کہا نہال صاحب یہ آپ کے کرنے کی باتیں نہیں۔ آپ تو ۔۔۔۔۔۔ جواں، ہر دم دواں، پیہم رواں قسم کی زندگی کے قائل ہیں، اپنے رنگ پر

قائم رہیے اور جوش کے کہنے کے مطابق اس "با قیاتِ فانی" آں جہانی یعنی تابش کی صحبت کا اثر نہ قبول لئے۔ کہنے لگے صاحب ہم کوئی بدلنے والے ہیں۔ ہم نہیں بدل سکتے۔ ہم تو زمانے کو بدلنے آئے ہیں۔ ہم تو ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز"

کے علمبردار ہیں اور پھر ماسٹر ممتاز حسین بی۔ اے (آنرز) بی۔ ٹی۔ دہلوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ رباعی سنائی :۔

پیدا ہوئے دو فلاسفر دنیا میں	میں اور فلاطون بہ یقین و سوگند
اس کو کیا چرخ پیر نے خم میں قید	مجھ کو کیا دفتر کی حوالات میں بند

لیکن ــــــ لیکن آج مجھے سب سے زیادہ نہال کی وہی غزل یاد آ رہی ہے جس کا ایک شعر میں نے ابھی ابھی نقل کیا کہ :۔

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام	خواب دیکھا کئے نادیدہ گلستانوں کے

نہال نے یہ خواب تنہا نہیں دیکھے، بلکہ سب کو دکھا کر دیکھے۔ اس نے ہمیشہ صحرا نشینوں کو نخلستانوں اور مرغزاروں ہی کے تذکروں میں بہلائے رکھا اور کبھی اپنے قدر دانوں کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ کسی بے آب و گیاہ جنگل میں ہے۔ وہ جس محفل میں اپنی ٹانگوں میں تین یا چار یا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ بل دے کر کرسی نشیں ہوتا تو عرش و کرسی سے بلندی پرواز کرتا اور اس بلند پروازی میں سب کو اپنا شریک بنا لیتا۔

صورت بہ ہر جا ہے "فراق" ہی لکھا رہتا لیکن باتیں بالعموم وہ وصل ہی کی کرتا۔ تابش جب کبھی انہیں "شاعرِ اعظم" کی گالی دیتے (یہ گالی تابش نے یوں وضع کی ہے کہ اس ترکیب کے پس منظر میں مرحوم رفیع احمد خاں لکھنوی کی ایک غزل ہے جو حضرتِ اصغر گونڈوی پر

انھوں نے اپنے مخصوص رنگ میں بے تکلفی میں کہی تھی، تو نہال صاحب مارے خوشی کے "نہال نہال ہو ہو جاتے اور تابش دہلوی کو گلے سے لگا لیتے اور اس وقت تک گلے سے لگائے رکھتے جب تک دو تین آدمی مل کر انھیں چھڑا نہ لیتے۔ نہال صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب کسی سے گلے ملتے تو اس کے بعد یہ بھول جاتے کہ اس سے الگ بھی ہونا ہے۔ اس غفلت کا نتیجہ یہ تھا کہ جس کے ایک دفعہ گلے لگے بس گلے کا ہار ہو گئے۔ فریق ثانی کے لئے اس ہڈیوں کی مالا کا اتارنا ہمیشہ ایک مرحلہ بن کر رہ جاتا اور بھولنے میں کچھ ایسی تشنر گربہ" بعض اوقات بپا کرتے کہ سب پریشان ہو جاتے۔ مثلاً گلے کسی بات پر ملنا چاہتے ہیں فضل حق قریشی صاحب سے اور باہیں ڈال دیں صلاح الدین قریشی صاحب کی گردن میں، یا الحاج حافظ سید وصی اشرف کی کمر میں، اور پھر وہ پنجے جھاڑ کر گویا عیدی ملتے کہ بایدوشاید۔ ہر شخص کے لئے اتنا بے پایاں خلوص کسی میں کب ہوتا ہے۔ !!

مرحوم نواب سراج الدین سائل دہلوی کے شاگرد نہال کو کبھی ان کے احباب میں سے کسی نے رنجیدہ نہ پایا۔ ہر دوست کو دیکھ کر کھل اٹھتے، اور اس وقت تک کھلکھلاتے رہتے جب تک کوئی پیٹھ ٹھونک کر ان کی ہنسی کا رُخ حلق سے باہر کی طرف نہ پھیر دیتا۔ ہنسی کا دورہ ان پر کچھ کھانسی کی طرح پڑتا اور جس طرح اچھو لگ جانے پر مائیں بچوں کی پیٹھ ٹھونکتی ہیں کہ کہیں بچے کا سانس رکا نہ رہ جائے۔ بالکل اسی قسم کی حرکت نہال صاحب کے بعض احباب کو بھی کبھی کرنی پڑتی۔ راستہ چلتے وقت اگر تنہا ہوتے تو ہمیشہ سنجیدہ صورت نظر آتے۔ فکر سخن میں مستغرق۔ فکر مندی یا حزن وملال کے آثار اس وقت بھی ان کے چہرے پر نظر نہ آتے۔ راستہ کبھی سیدھا نہ چلتے۔ دیکھنے والوں کو ہمیشہ یہی محسوس ہوتا کہ یہ سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لیے پر تولے رہے ہیں حالانکہ

ان کا مقصد کنارے کنارے سیدھی راہ چلنا ہی ہوتا۔ تانگے، موٹریں، گاڑیاں بگھیاں وغیرہ ساری عمر ہر سڑک پر خود ان سے بچتی رہیں۔ نہال صاحب نے کسی حادثے سے بچنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ گرمیوں میں شیروانی کی آستینیں کہنیوں بلکہ بعض اوقات کھوؤں سے اوپر تک چڑھائے رکھتے اور سردیوں میں یہ بھول جاتے کہ اب گرمیاں نہیں ہیں۔ شعر اکثر وہ چلتے پھرتے ہی کہہ لیا کرتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی رسالے وغیرہ کے اڈیٹر نے انھیں دفتر میں ٹیلیفون کیا ——— ٹیلیفون پر غزل کا تقاضا سنا اور دفتر کا سب کام جوں کا توں چھوڑ چھاڑ جس اڈیٹر نے ٹیلیفون کیا ہوتا اس کی سمت چھوٹ جاتے ——— اور ہمیشہ ایسے بے مہار "چھٹتے" کہ جس جس سڑک پر سے گزرتے وہاں کے "ٹریفک" کا نظام درہم برہم کر جاتے۔ موٹروں کے ہارن، قریب سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں، گاڑیوں بگھیوں کی گڑگڑاہٹ، غرضیکہ ہر شور و غوغے سے بے نیاز بگٹٹ بس اس اڈیٹر کے پاس سرپٹ اور بیرنگ گاڑی ہو کر پہنچنے کی فکر میں رہتے جس نے غزل کا تقاضا کیا ہوتا۔ راستے میں جب غزل مکمل ہو جاتی تو کہیں بھی لکھنے کو رک جاتے، کہیں بھی۔ جگہ کی قید کے قائل نہ تھے۔ مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو ——— یہ بیٹھ کر غزل کسی دفتری کے کاغذ پر رقم کرتے اور اگر کوئی جاننے والا ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا تو اپنی غزل اڈیٹر کو پہنچا کر ہی دم لیتے۔ ہاں اگر کوئی ذرا سی جان پہچان کا آدمی بھی نظر آجاتا تو پھر ان سے کسی وعدے کا پاس ممکن نہ تھا۔ جب تک وہ جاننے والا خود ہی ان کا پیچھا نہ چھوڑ دیتا۔ یہ اس سے جدا ہونے کا نام نہ لیتے۔ کبھی اگر کسی رسالے وغیرہ کا مدیر یا کسی مشاعرے کا کوئی مہتمم کہیں، ان سے اگر شکایت کر بیٹھتا کہ دیکھئے نہال صاحب حسب وعدہ آپ نے غزل نہ بھیجی یا آپ مشاعرے میں تشریف نہ لائے تو یہ جواب میں بالکل میرزا ادیب کے

"صحرا نورد کے خطوط" کے پہلے ایڈیشن کا سرورق بن جاتے معذرت پیش کرنے کا ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ اکثر جب انھیں اُلٹے جوتے پہنے ہوئے دیکھ کر جنہ بز ہوتے تو شاہد صاحب ہمیشہ ان کی یہ کہہ کر حمایت کرتے کہ جوتے انھوں نے سیدھے ہی پہنے ہیں، پیر اُلٹے لگ گئے ہیں، نہال شاہد صاحب کی اس حمایت پر اپنے سر کے بال پیچھے کی طرف زور سے گھسیٹتے اور آسمان کو گھورتے۔

جس دفتر میں یہ ملازم تھے وہاں اچھے خاصے اوسط درجے کے افسروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ لیکن ان کا ماتحت عملہ ہمیشہ ان کے لااُبالی پن سے فائدہ اٹھاتا اور ان کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے اپنا کام بھی انھیں سے لیتے۔ اس وجہ سے اکثر رات گئے تک دفتر کی خودساختہ حوالات میں بند رہتے اور پھر بہت سی فائلوں کا پلندہ بغل میں مار کر کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کرنے پہنچ جاتے اور کبھی گھر کا رُخ کرتے۔ ان کے لئے شاید گھر اور دفتر میں کوئی فرق نہ تھا۔ کاموں کے دفتر اور دفتر کے کاموں سے انھیں عمر بھر نجات نہ مل سکی؛ وہ اس بد دفتر کی دفتر خوریں کہیں —!

نہال صاحب کا بڑا لڑکا جس نے بی۔ اے کر لیا تھا اور جو نہال صاحب کو اپنی سب اولادوں میں سب سے زیادہ عزیز تھا جب دق میں مبتلا ہو کر باوجود نہال صاحب کی حسب استطاعت کوششوں کے جانبر نہ ہو سکا تو انھوں نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور کسی سے اس حادثۂ جانکاہ کا ذکر تک نہ کیا۔ جب تک کہ از خود ان کے احباب کو اس کا علم نہ ہو گیا۔ سب کو معلوم ہونے کے بعد بھی کسی سے اپنی اس جان کنی کا ذکر خود نہ کرتے اور اگر کوئی ان کے سامنے ان کے لڑکے کی ذہانت اور طباعی کا ذکر نکالتا تو یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے کہ —— ہاں صاحب اب کیا کیا چلئے۔ کوئی کیا

کر سکتا ہے! جو ہونا تھا ہو گیا ــــــ!!

جو ہونا تھا یا نہیں ہونا تھا، وہ تو ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔ پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی تلقین تو سب ہی کریں گے لیکن کوئی ایسی ٹھوس بات ہونی چاہئے جس سے دائمی پسماندگان کے کچھ آنسو پچھیں، اور مجھے رہ رہ کر وہی "یادگار" پتھر یاد آرہا ہے جہاں "یاران علم وادب" نے بیٹھ کر وہ فیصلے کئے ہیں کہ بعض لوگ صوفوں اور قالینوں پر کیا کریں گے ــــــ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں ــــــ!!!

(ماہنامہ "نقوش" مئی ۱۹۵۲ء)

قصّہ سوتے جاگتے کا

اب سے کوئی دس برس پہلے کا ذکر ہے، دلّی میں میراجی نے ایک روز مجھ سے کہا
آپ سے ملئے! میں نے پوچھا کرتے کیا ہیں، معلوم ہوا کام شاعر کا۔ میں نے پوچھا ذریعہ معاش
آپ کا؟ میراجی نے جواب دیا۔ جرنلزم! میں پھر بھی مطمئن نہ ہوا اور پوچھا آخر کھاتے کہاں سے
ہیں۔ تب ہز ایکسی لنسی" محمد خلیل الرحمٰن صاحب نے گویا چونک کر جواب دیا کہ یہ بالکل ایک نجی قسم
کا سوال ہے اور اس کا جواب بے تکلف تعلقات کے بعد خود بخود آپ کو مل جائے گا۔ پھر
خلیل صاحب نے خود ہی یہ کہہ کے بے تکلفی کا آغاز کیا کہ سامنے کے ہوٹل میں کیوں نہ بیٹھیں
چنانچہ ہم لوگ یعنی میراجی، خود "ہز ایکسی لنسی" خلیل الرحمٰن، مختار صدیقی اور تابش دہلوی ہوٹل میں
جا بیٹھے ہمیں کہیں سے ایس۔ ایس۔ ٹھاکر نے دیکھ لیا اور لپک کر ہماری میز کے پاس آئے
اور پھر اسی رفتار سے مڑ کر واپس جانے لگے۔ میراجی نے جب ٹھاکر کو روکنا چاہا تو انھوں نے
کہا۔ آپ کے ساتھ اس وقت کوئی نئے صاحب ہیں اور آج چونکہ ہفتہ ہے جس کے عدد ایک
حساب سے آٹھ ہوتے ہیں اس لئے آج کے دن میں کسی نئے آدمی کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا
مختار صدیقی صاحب نے جب ٹھاکر سے کہا کہ "مائی ڈیر" اب آپ اس میز تک آ ہی گئے ہیں
اب یہیں بیٹھنا ہوگا اور پھر یہ کہ آپ انھیں نیا نہ سمجھئے بلکہ سرے سے آدمی ہی نہ سمجھئے تو ٹھاکر
یہ کہہ کر ہماری میز پر بیٹھ گئے کہ اچھا خیر میں انھیں وجے راگھوراؤ سمجھتا رہوں گا کیونکہ ان کی

صورت وجے راگھو راؤ میں بہت ملتی ہے۔ مختار صدیقی نے کہا یہ وجے راگھو راؤ کی توہین ہے وہ اتنی عمدہ بانسری بجاتا ہے اور رقص کرتا ہے اور یہ صرف ــــ تابش نے لقمہ دیا ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اور پھر تابش نے کہا پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ "ہز ایکسی لنسی" آدمیوں کی صف میں شمار بھی کئے جاسکتے ہیں یا نہیں۔ اس پر خلیل صاحب کو یوں لب کشائی کرنی پڑی "آپ لوگ اپنی حدود سے آگے بڑھ رہے ہیں!" اسی اثنا میں ہوٹل کا بوائے حسب معمول ٹھاکر کے پاس آکر کھڑا ہوا اور سب کے مشورے سے کھانے کا آرڈر دے دیا گیا۔ کھانے کے بعد جب ٹھاکر نے سب کا "بل" ادا کر دیا تو مختار صدیقی صاحب نے خلیل صاحب کو چھیڑنے کے لئے گویا سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا۔ اب آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا "ہز ایکسی لنسی" کھاتے کہاں سے ہیں۔

خلیل صاحب نے جواب دیا۔ مختار صاحب میرے دل میں آپ کی وقعت دق کے جرثومے کے برابر بھی نہیں۔ میری گورنمنٹ اس قسم کے حشرات الارض کو گوارا نہیں کرسکتی۔ تابش صاحب نے پوچھا کہ حضور وہ آپ کی گورنمنٹ ہے کہاں ؟ اس پر خلیل صاحب کو کہنا پڑا کہ ہاں یہ بات میں نے قبل از وقت کہہ دی اور یوں خلیل صاحب سے خاکسار کو پہلی مرتبہ نیاز حاصل ہوا۔

اس کے بعد خلیل صاحب سے تقریباً روز ہی ملاقات رہنے لگی۔ مختار صدیقی صاحب جب کسی ملاقات میں شریک ہوتے۔ یہ فقرہ کسی نہ کسی نازک وقت میں ان پر ضرور چپکا کر دیتے "ہز ایکسی لنسی یہ کوسنی" از فیلنگ۔ بو وایٹ دی مومنٹ" اور خلیل صاحب اس قسم کی تکرار کو کوئی اہمیت نہ دیتے۔ ایس۔ ایس۔ ٹھاکر۔ میں اور میراجی ان کی "کنگ آف سیام" کے انداز کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے انھیں اکثر فلم ساتھ دیکھنے کی دعوت دیتے اور تانگے میں بٹھا کر خلیل صاحب کو جہاں چاہتے لے جاتے۔ خلیل صاحب کی گفتگو میں

"خاشیت" اور کبھی کبھی شہنشاہیت کی رعونت ہر لمحے کار فرما رہتی اور ان کی یہی خصوصیت باقی افراد سے ان کو ممیز کیے رکھتی "نقشے" کے فلسفے کے اس حافظ کو ہٹلر اور مسولینی میں وہ وہ خوبیاں نظر آتیں جنھیں سن کر "عوام الناس" دنگ رہ رہ جاتے۔ ہٹلر اور مسولینی کے کارناموں پر یہ خود ان ڈکٹیٹروں سے زیادہ مسرور نظر آتے اور ان کی ناکامیوں کو محض اتفاقات پر محمول کرتے۔ کوئی دو برس کی بے تکلف ملاقات کے بعد خلیل صاحب نے مجھے اپنی ایک نظم سنائی۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند آئی کہ انھوں نے اپنی اس صلاحیت کو ظاہر کرنے میں اور شاعروں کی طرح بے صبری سے کام نہیں لیا۔ یہ انتہائی عالی ظرفی کی علامت ہے کہ کوئی جو کچھ لکھے یا کہے وہ اپنے قریب ترین احباب تک کو نہ سنائے۔ اتنا ضبط کسی میں کب ہوتا ہے۔!

وہ نظم اب مجھے یاد نہیں اور نہ شاید وہ ان کے اس مجموعہ میں شامل ہے جو ۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو مجھ تک پہنچا۔ خلیل صاحب کی نظموں کے اس مجموعے کا نام ہے "لمحے" اور ن۔م راشد اور بعض ترقی پسند شاعروں کے مجموعوں سے زیادہ اختصار اس کے انتخاب میں برتا گیا ہے جس طرح "ماورا" اور ایسے دوسرے مجموعوں کو پڑھ کر کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے گرد پوش عملِ چغتائی سے مزین ہے اور "چغتائی آرٹ" چونکہ عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہے اس لیے صرف خواص ہی اس سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ دوسری چیز اس دیوان کی جو باعثِ کشش ہے وہ خود خلیل صاحب کی تصویر ہے جس میں وہ اپنے اس شعر کی تصویر بنے ہوئے ہیں ؎

اب ایک عالمِ حیرت ہے زندگی اپنی
وہ ایک عالم حیرت نظر سے گذرا ہے

یہ مجموعہ خلیل صاحب نے "پاکستان کے ان بہادر سپاہیوں کے نام معنون کیا ہے جو

پاکستان کی سرحدوں پر سینہ سپر کھڑے پاکستان کی عزت و عظمت کی حفاظت کر رہے ہیں:؛

پھر خود خلیل صاحب کا لکھا ہوا وہ پیش لفظ ہے جس کے پہلے ہی فقرے پر بعض لوگ بے انتہا بحث کی گنجائش محسوس کر سکتے ہیں "پیش لفظ" کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

"روایتی شاعری کی پر شکوہ صدیوں کے سامنے جدید شاعری ایک لمحہ ہے لیکن ایسا لمحہ کہ روایتی شاعری کی تمام صدیاں اس کی تزئین و تقویت میں کام آ رہی ہیں اگر فلسفۂ شعر کے مقام نظر سے گذشتہ شاعری کا بتدریج مطالعہ کیا جائے تو ہم لازمًا اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جدید شاعری گذشتہ شاعری کا حاصل ہے بلکہ مقصود ہے روایتی شاعری سے جدید شاعری کا ارتقائی تعلق ہے اور زندگی کا عمومی اصولِ ارتقا، اس نظریئے کی صحت کا ضامن ہے۔"

خود مذکورہ مجموعے کے پیش لفظ ہی کو اگر اسی خشوع و خضوع سے پڑھا جائے جس جاں فشانی سے خلیل صاحب نے اسے رقم کیا ہے تو بعض افراد کو اس بیان کا تضاد ڈھونڈ لینے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ خلیل صاحب نے خود ہی لکھ دیا ہے:-

"نظم معرا کے سلسلے میں قافیے کی بحث بالکل بے معنی ہے کیونکہ اس سے قافیے کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اسے جس صورت میں انگریزی سے لیا گیا ہے اس میں قافیے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

مارنے کا ہاتھ روکا جا سکتا ہے لیکن کہنے والے کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا اور کہنے والے یہ کہہ کر رہیں گے کہ جب خلیل صاحب نے خود یہ مان لیا ہے کہ اس صنفِ سخن کو انگریزی زبان سے جوں کا توں اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہے تو پھر اردو کی روایتی شاعری کی

ارتقائی شکل "نظمِ معرا" کیونکر ٹھیری ؟ اسی پیش لفظ میں یہ بھی آیا ہے کہ :-

"کسی زبان کا کوئی جامد مزاج نہیں ہوتا۔ زبان وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے

اور زبان کا مزاج رائج الوقت فلسفے پر مبنی ہوتا ہے"

یہ پھر ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی جیسے اردو شاعری کے کہنہ مشق نقاد کا قول ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے اور ان کا یہ کہنا ہے کہ اردو زبان کا مزاج نظمِ معرا کا متحمل اسی طرح نہیں ہو سکتا جس طرح ہمارے تمدن کا مزاج عورت کو مغربی لباس میں دیکھنے کا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی اکثر دتی اور میرٹھ کی ادبی محفلوں میں نظمِ معرا یا جدید شاعری (یا جو بھی آخری نام اس صنفِ سخن کا آخری طور پر آئندہ چل کر تجویز کیا جائے) کے بارے میں یہ دلیل پیش کر چکے ہیں کہ مغرب کے تمدن کا اثر جس حد تک ہم نے قبول کیا، اس میں بالکل ہو بہو انگریز قسم کے دلیسیوں کا بھی یہ حال ہے کہ ان کی عورتیں ساڑھی ہی باندھتی ہیں یا اور اسی قسم کا کوئی دیسی لباس، زیادہ سے زیادہ ذرا سی مختلف کتر بیونت کے ساتھ پہن لیتی ہیں لیکن سکرٹ ساری عمر خود یورپ میں رہنے کے بعد بھی نہیں پہنتیں بعض مرد مغربی تہذیب کے اثر سے جہاں بالکل انگریز تنا بن کر رہ گئے ہیں وہاں ایک بھی عورت سوائے عیسائیوں اور پارسیوں کے ایسی نہ نکلی کہ عین مین میم صاحب نظر آتی۔ جدید عورت جہاں "زلف بریدہ" ہونے اور ناخن بڑھانے میں مغربی عورت کی نقالی میں سرمو فرق نہیں کرتی وہاں "سکرٹ" پہننے میں اس کے لئے ہمارے ملک کے تمدن کا مزاج جس طرح حائل ہے۔ اُسی طرح وہ کہتے ہیں ہماری زبان کا مزاج نظمِ معرا کو قبول نہیں کر سکتا۔ وہ کہتے ہیں اردو زبان کا مزاج یہ ہے کہ ایک تلنگے والا بھی یوں تُک بندی کرتا ہے کہ ؎

سرے مولا بلالے مدینے مجھے　　　تانگے والے "پہنچا دے مدینے مجھے

ان کا کہنا ہے کہ جہاں کے تانگے والے ردیف قافیے کے بغیر راستہ نہ چلیں وہاں نظم معرا کا کامیاب یا مقبول ہونا کیسے ممکن ہے؟! اب یہ الگ بات ہے کہ نظم معرا کے سلسلے میں اس مثال کو غیر متعلق سمجھا جائے اور وجہ یہ بیان کی جائے کہ جدید شاعری تانگے والوں کے لئے ہے ہی نہیں۔ ڈاکٹر شادانی نے اس سلسلے میں جہاں تک مجھے یاد ہے ماہنامہ "ساقی" میں ایک سے زیادہ مضامین سپرد قلم کئے تھے جن میں مختلف زبان کے مزاج ہی کی بنیاد پر نظم معرا پر انھوں نے تنقید کی تھی اور کئی معرا نظموں کو پہلے ایک بحر میں شروع سے آخر تک منتقل کر گئے اور پھر قافیے اور ردیف سے آراستہ کر کے ناظرین سے یہ پوچھا تھا کہ بتایئے ان نظموں کے حسن میں کچھ اضافہ ہوا یا نہیں۔ وہ اردو غزل اور نظم میں جدید خیالات اور اقدار کے سمونے کے تو قائل ہیں اور اُسے نہ صرف ضروری سمجھتے ہیں بلکہ خود اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار باوجود "روایتی شاعری" کے قالب میں ہونے کے جدید رجحانات کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ؎

اک چاندنی سی چاک گریباں سے آشکار
وہ نوش لب میں کیفِ بہشتی شراب کا

اس قسم کے بہت سے اشعار ان کے "ساقی" میں چھپ چکے ہیں جن کے نقل کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ موقع تو آپ کہیں گے کہ ڈاکٹر شادانی کے اس قسم کے حوالے کا بھی یہاں نہیں تھا لیکن خلیل صاحب کے مذکورہ پیش لفظ میں یہ پڑھ کر کہ کسی زبان کا کوئی جامد مزاج نہیں ہوتا، مجھے ڈاکٹر عندلیب شادانی کی یہ باتیں یاد آگئیں۔ خلیل صاحب نے مذکورہ پیش لفظ میں جہاں یہ لکھا ہے کہ:-

"روایتی شاعری سے جدید شاعری کا تعلق ارتقائی ہے اور اسے حریفانہ تعلق سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ قدیم اور جدید شاعری کو ایک ہی سلسلے کے دو مختلف مدارج کہا جا سکتا ہے جن میں تقدیم و تاخیر تو ہے۔ تضاد بالکل نہیں ہے جدید شاعری کا زندگی سے بھرپور شگوفہ روایتی شاعری ہی کی توانا شاخوں پر پھوٹا ہے۔ یہ اس سے الگ یا متضاد چیز نہیں ہے۔"

وہاں اس پیش لفظ میں یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ:۔

"واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں اصناف میں کوئی رقابت نہیں ہے اور کسی زاویۂ نظر سے ان کے موازنے کی گنجایش نہیں ہے۔ غزل اردو ادب کی ایک کلاسیکی صنف ہے اور نظم معرا موجودہ زمانے میں انگریزی سے اردو میں داخل ہوئی ہے۔"

کہنے کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے پر خلیل صاحب کو دو پیش لفظ لکھنے چاہیئے تھے تاکہ ایک پیش لفظ میں یہ ثابت کر دیا جاتا کہ نظم معرا روایتی شاعری کی ارتقائی شکل ہے اور دوسرے پیش لفظ میں یہ نظریہ پیش کیا جاتا کہ یہ صنف سخن چونکہ براہ راست انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئی ہے اس لئے موازنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب اس پیش لفظ میں لوگ یہ پڑھیں گے کہ:۔

نظم معرا کی فنی حیثیت اور محاسن پر روشنی ڈالنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس کی کامیابی سے غزل کی فنی ناکامی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ غزل ایک الگ صنف سخن ہے اور اس کی اپنی ایک منفرد فنی حیثیت ہے" اور "اردو شاعری کی تمام کلاسیکی اصناف میں سے غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو جدید زمانے کی ضروریات کو سب سے زیادہ خوبی کے ساتھ پورا کر رہی ہے۔"

تو پھر یہ بات کم لوگوں کی سمجھ میں آسکے گی کہ کیوں خلیل صاحب نے مذکورہ بالا طریقے پر اپنے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ کا آغاز کیا اور بعض افراد کو اعتراض کرنے کا موقع دیا۔

درحقیقت اس قسم کی الجھن کا شکار صرف وہ لوگ ہوں گے جو مذکورہ پیش لفظ کو صرف "لا تقربوا الصلوٰۃ" کی عینک سے دیکھیں گے اور اس پیش لفظ پر مندرجہ بالا تنقید اگر اسے تنقید کہا جا سکے؛ ایک طرح سے اسی گروہ کی تسکین کا سامان فراہم کرسکے گی جو سیاق و سباق سے روگردانی کرکے اپنے مطلب کے فقرے چن لیتے ہیں اور بزعم خود اپنی ناک اونچی رکھنے میں عارضی طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے بعد خلیل صاحب نے یہ ایک اپنی قسم کا علیٰحدہ مقدمہ کھڑا کر دیا ہے اور اس پر ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر غور کرنے کی ضرورت ہے — پیش لفظ کے بعد خلیل صاحب کے کلام کو از اوّل تا آخر پڑھ کر جو بات محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ خلیل صاحب نے "اپنے کم و بیش دس سال" کے کلام سے خود جو انتخاب کیا ہے اس میں شدید بے رحمی سے کام لیا ہے۔ پہلی نظم دعا ہے لے کر آخری چیز لمحے تک نظمیں، غزلیں، گیت، متفرق اشعار وغیرہ پڑھ کر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی ایک لفظ بھی جھوجرا یا ایک مصرع بھی بھرتی کا ہے۔ میری ذاتی رائے میں اس مجموعے کا نام "گلزارِ خلیل" ہونا چاہیئے تھا۔ خلیل صاحب کے اس مجموعے نے گلستانِ ادب میں ایک ایسی خوشنما باغیچی کا اضافہ کیا ہے جس میں خار و خس کم کیا سرے سے نظر ہی نہیں آتے۔ صرف پھول ہی پھول ہیں "لمحے" میں خلیل صاحب نے اپنے انداز میں گل و بلبل سے لے کر فوجی بینڈ تک کی باتیں کی ہیں۔ ان باتوں میں گلوں کی مہک، شراب کا نشہ اور ایک خاص زاویہ حیات کی حرارت ہے۔ اب یہ بات الگ ہے کہ جس قسم کی زندگی کی حرارت ان کے کلام میں آپ کو محسوس ہو، اس زندگی ہی کے سرے سے آپ قائل نہ ہوں کیونکہ اس زندگی کی حرارت

کا پس منظر LIVE DANGEROUSLY کا اصول حیات ہے۔ وہی "نقشے"!!
مثال کے طور پر "فوجی بینڈ" کا ایک آدھ بند ملاحظہ کیجیے:۔

خون خون خون

خون خون خون

خون

خون

خون

بڑھ رہی ہے سیل بے پناہ کی طرح صدا
خون ہی سے خوش رہا ہے زندگی کا دیوتا
خون ہی سے آدمی کی داستاں میں رنگ ہے
زندگی میں کچھ نہیں ہے جشن خون کے سوا
آدمی کی سرگذشت سرگذشت جنگ ہے
گرم خون
تیز خون
بڑھ رہی ہے سیلِ بے پناہ کی طرح صدا
خون خون خوں

خون

خون

خون

یہ تو خیر ہوئی "LIVE DANGEROUSLY" کی بات لیکن جب خلیل صاحب قیلولے کی کیفیت میں ہوتے ہیں اور یہی کیفیت ان پر بالعموم بظاہر طاری رہتی ہے جس کو یار لوگوں نے سونے سے تعبیر کیا ہے تو پھر ان کی فکر سخن کا اندازہ وہ ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے اسی مجموعے میں "گیا وقت" کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔ "گیا وقت" میں خلیل صاحب کی شخصیت کا مکمل پرتو ان کے احباب کو نظر آسکتا ہے۔ کہتے ہیں:۔

ہواؤں کی بے تاب موجوں میں سو یا رہا ہوں
چمن میں بہاریں
بہت بے ہلکے مرتب ہوائیں
ہر اک لمحہ ایک نغمۂ نرم رو بن کے آتا رہا ہے
بکھر کر
ہر اک شاخ ہر پنکھڑی میں سماتا رہا ہے۔
اسی طرز سے رنگ و بو کی طلسمی فضاؤں نے تشکیل پائی
شباب چمن کی سنہری کرن مسکرائی!
ہر اک سمت پھر تو شگوفوں کا پھولوں کا طوفان تھا
جو اُمڈتا رہا ہے
شباب چمن کا ہر اک لمحہ پھر رنگ بن کر اڑا ہے
یونہی ہلکے ہلکے وہ طوفان مٹا ہے
مناظر کی دھندلاہٹوں میں اُسی کا نشاں ہے
اُسی کی نشانی یہ دورِ خزاں ہے

کھلی آنکھ تو دل میں لمحہ بہ لمحہ خلش بڑھ رہی ہے
تمنا کی خاموشیوں سے بھی گہری کسک بڑھ رہی ہے

کوئی بھول ہو تا :

"لمحے" کا جو نسخہ مجھ تک پہنچا ہے اُس پر خلیل صاحب نے اپنے قلم سے لکھ دیا ہے ——
"اخلاق صاحب ان میں کچھ لمحے اُس دنیا کے بھی ہیں جس میں میراجی مرحوم، آپ اور میں اور بہت سے اور دوست اکٹھے رہا کرتے تھے" میں نے اس "گلزار خلیل کی سیر کر لی۔ اب معلوم نہیں دلی یا شملے میں ایس۔ ایس بٹھاکر، راولپنڈی میں مختار صدیقی اور کراچی میں مسعود الحسن تابش دہلوی کو بھی حضرت خلیل کے صاحبِ صحیفہ ہونے کی اطلاع ملی یا نہیں ؟
میراجی تو بمبئی کو پیارے ہوئے۔ !!

(ماہنامہ الحمرا، ستمبر ۱۹۵۲ء)

شاہد لطیف کی شادی

یہ قصہ ہے جب کا ـــــ کہ ہم سب مل کر فرصت کے اوقات میں نمبر ایک دریا گنج دلّی میں شاہد لطیف کے کمرے میں بیٹھ کر سیاسیات، ادبیات، اقتصادیات، جنسیات اور فحشیات سے لے کر لغویات تک پر بحث کر کے رکھ دیتے تھے۔ شاہد لطیف صاحب ان دنوں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی زیر نگرانی ہندستانی ڈکشنری کی ترتیب میں کام کر رہے تھے۔ پچھتر روپے ماہوار ان کو ملتے تھے اور دوسری جنگ عظیم سے پہلے پچھتر روپے کی کیا قیمت تھی یہ کچھ ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ نمبر ایک دریا گنج کا شمار باعتبار مکانیت بھی دلّی میں اُس زمانے کی اول نمبر کی کوٹھیوں میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اس مکان میں جیسے جیسے عدیم النظیر سیاسی اور ادبی اجتماع ہوئے اُس نے اِس کوٹھی کی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ شاہد لطیف کو اس سلسلے میں خوش قسمت سمجھا جاتا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ دلّی کے نہایت اہم مکان میں مقیم تھے بلکہ اس صورت میں کہ بڑے بڑے ادیب اور شاعر جس دور میں جوتیاں چٹخاتے پھر تھے۔ انھیں پچھتر روپے ماہوار تنخواہ بھی ملتی تھی۔

پر شاہد لطیف اُس زندگی پر قانع نہیں تھے۔ اُن کا زندگی کا پروگرام یہ تھا کہ وہ ادیبوں میں سب سے زیادہ روپیہ کمائیں اور عصمت چغتائی سے شادی کریں اور پھر

والی وڈ کے اس جوڑے کی سی زندگی گذاریں جس میں بیوی فلم کے لئے کہانیاں لکھتی تھی اور میاں اُن کہانیوں کو ڈائرکٹ کرتا تھا اور جن کی ایک چھوٹی سی خوبصورت بچی بھی تھی شاہد لطیف کا عصمت کا شوہر اور فلم کا ڈائرکٹر بننے کا شوق ہم سب کو اُس وقت محض شوق فضول و جرأت رندانہ" معلوم ہوتا تھا جس پر کبھی کسی نے سنجیدگی سے شاہد لطیف کو نہ ٹوکا ہاں البتہ جب یہ خبر کتب خانۂ علم و ادب تک پہنچی جو اُردو بازار دلی میں اُس وقت ہر قسم کے ادیبوں اور شاعروں کی نشست گاہ تھی تو وہاں سب نے ان کے اس عزم کا خوب خوب مذاق اڑایا اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ صادر کیا کہ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں!

بظاہر اس جنون سے باز رکھنے کے لئے اسد، ظفر قریشی، صلاح الدین قریشی اور میں شاہد لطیف کو اکثر "قطب صاحب" یا ہمایوں کے مقبرے لے جایا کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے آپ کو شاید معلوم ہی ہو کہ بیئر کی بوتل باقاعدہ خریداروں کو سات آنے میں ملتی تھی اور اگر خالی بوتل واپس کر دو تو اور ایک آنہ کم میں کام ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک ایک آنہ کی کوری صراحیاں خرید لی جاتیں اور اُن میں آٹھ آٹھ، نو نو بیئر کی بوتلیں بھر کر قطب مینار یا اوکھلے کا رخ کیا جاتا اور دن دن بھر بیئر کا دور چلتا لیکن اس کے بعد بھی شاہد لطیف پر فلم ڈائرکٹر اور عصمت کا شوہر بننے کا "جن" سوار رہتا۔

اس تام جھام کے باوجود ایک دن "جن" کی ایک محفل میں (جن ان دنوں شاہد لطیف کی محبوب "ڈرنک" تھی) ان حضرت نے اپنا آخری فیصلہ سب کو سنا دیا اور کہا کہ آپ لوگ مانیں یا نہ مانیں میں بمبئی جا رہا ہوں ظفر قریشی کی انگریزی چونکہ شاہد لطیف کو بہت پسند تھی اس لئے اُن سے کہا گیا کہ خواجہ احمد عباس کو ایک خط لکھ دو۔ ظفر نے پہلے پہل اپنے زمانے

کے اتالیقوں کی طرح شاہد لطیف کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب مفر ممکن نہ دیکھا تو پھر آخر کار انگریزی لکھ ماری۔

خواجہ احمد عباس کا جواب آیا کہ "بمبئی ٹاکیز" میں اتفاق سے ان دنوں ایک مکالمہ نویس کی ضرورت ہے اور حتی الامکان اس معاملے میں سعی حاصل سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر یہاں سے کوئی پیش کش کی جائے تو اسے فوراً اگر کر قبول کر لینا مضر رہے گا۔ اس لئے جب تک میں نہ لکھ دوں یہاں کی ملازمت کی حامی نہ بھرنا۔ کچھ ہی دن بعد "بمبئی ٹاکیز" سے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا آفر ایک فلم میں مکالمہ نویسی کے لئے آگیا۔ جسے سب کی منشا کے خلاف شاہد لطیف نے قبول کر لیا اور بذریعہ تار جلد پہنچنے کی اطلاع مسز ہمنسو رائے یعنی دیویکا رانی کو بھیجدی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے انداز میں شاہد لطیف کو ڈانٹا۔ جس کا ترجمہ آسان اردو میں یہ تھا کہ تم سا دال بریلی کا رہنے والا علی گڑھ سے بی۔ اے کرنے کے بعد بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں کامیاب زندگی نہیں گذار سکتا لیکن اس ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ہی ساتھ نہ صرف مولوی صاحب نے دو سو روپے شاہد لطیف کو سفر کی تیاری کے لئے دئے بلکہ سہراب مودی کے نام ایک خط بھی لکھ دیا تاکہ بمبئی میں انھیں زیادہ دقتیں نہ اٹھانی پڑیں۔ اور ایک ناول انھیں ترجمہ کرنے کے لئے دے دیا۔ شاہد لطیف نے ترجمہ کے پیشگی معاوضے سے پہلی مرتبہ کچھ سوٹ وغیرہ سلوائے کیونکہ دوستوں نے یہ رائے دی کہ فلم کمپنی میں علی گڑھ کی طرز کا ڈھیلی موری کا پاجامہ اور شیروانی موثر لباس نہیں رہے گا اور سینے پہ پتھر کی سل رکھ کر بی۔ بی اینڈ سی۔ آئی آر کے ایک تیسرے درجے کے ڈبے میں انھیں سوار کرا دیا اور نصیحت کر دی کہ وہاں کی عورتوں کے جال میں نہ پھنسنا، شراب نہ پینا اور جب بمبئی ایک اسٹیشن پر رہ جائے تو دوسرے

درجے کا ٹکٹ خرید لینا تاکہ کوئی تمھیں وہاں تیسرے درجے کا آدمی نہ سمجھے۔ جب گاڑی نے حرکت کی تو شاہد لطیف نے کھڑکی سے منھ باہر نکال کر سرگوشی کے انداز میں ظفر قریشی سے اور مجھ سے کہا کہ دیکھنا وہ عصمت والا معاملہ بھول نہ جانا۔ وہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ زندگی کا سارا پروگرام نامکمل رہ جائے گا اور ہم نے اس طرح وعدہ کیا جیسے عصمت چغتائی اُدھار کھائے بیٹھی تھیں کہ کب ہم کہیں اور وہ شاہد لطیف سے شادی کرنے کو آمادہ ہو جائیں۔ اسد کی، میری، ظفر قریشی اور صلاح الدین قریشی کی اس وقت وہی کیفیت تھی جو بوڑھے والدین کی اکلوتی بیٹی کو پردیس دیتے وقت ہوتی ہے۔ اس غم کو غلط کرنے کے لئے ہمیں دلّی ریلوے اسٹیشن ہی کے بار اسپنیسر میں جا کر بیٹھنا پڑا۔

شاہد لطیف کا مہرا ابھی ہم لوگ کر ہی رہے تھے کہ عظیم بیگ چغتائی کے انتقال نے ادیبوں میں صفِ ماتم بچھا دی۔ میں نے ان کی چھوٹی بہن عصمت چغتائی کو تعزیتی خط لکھا جس کا جواب آیا۔

جودھپور — ۲۶ راگست ۴۱ء

مائی ڈیر اخلاق صاحب

آپ کے ہمدردی بھرے خط کا شکریہ! ان کے انتقال کے بعد ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ روحانی دکھ کیا ہوتا ہے۔ ہر وقت اُن کا خیال آتا رہتا ہے۔ آخری دنوں میں تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ نہ جانے ان ہڈیوں کے ڈھانچے میں اتنا دکھ اُٹھانے کی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ دعا کیجیے خدا اُن کے بچوں کا مددگار رہے۔

مرتے مرتے زبان اور حواس درست تھے۔ ہم لوگ تو سمجھتے تھے کہ ہم بہن بھائیوں کو موت نہیں آسکتی۔ زیادہ آداب — عصمت چغتائی

یہاں یہ حادثہ گذر گیا لیکن شاہد لطیف کو بمبئی میں اپنے ہی کاموں سے فرصت نہ تھی جس کا اظہار ایک خط میں انھوں نے یوں کیا :-

---

بمبئی ٹاکیز سٹوڈیو

ملاڈ ــــــ بمبئی

مائی ڈیر اخلاق !

بھئی معاف کرنا بہت تاخیر سے لکھ رہا ہوں. کیا کروں فرصت ہی نہیں ملتی صبح سے شام ہو جاتی ہے کام کرتے کرتے. سنا تھا دو ملاؤں میں مرغی حرام ہو جاتی ہے مگر یہاں دو کی بجائے پانچ چھ سے سابقہ پڑا ہے. بہر طور یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ فلم ٹکنیک اچھی طرح ذہن نشیں ہو جائے. غالباً یہ سلسلہ مہینہ ڈیڑھ مہینے تک چلے گا.

میرا پروگرام سنو۔

صبح آٹھ بجے اسٹوڈیو آنا پڑتا ہے

۸ سے گیارہ بجے تک اسٹوڈیو میں فلم کی CONTINUITY کا کام کرنا پڑتا ہے

۱۱ سے ایک تک وہ تمام اُردو ہندی کہانیاں پڑھنا پڑتی ہیں جو مختلف ادیب کمپنی کو بھیجتے ہیں اور اُن کی خاصی تعداد ہوتی ہے

۱ سے ۲ تک LUNCH TIME

۲ سے ۴ تک لائبریری کی اردو ہندی کتابوں کو پڑھ کر اُن کا خلاصہ بنانا پڑتا ہے جو دوسری صبح کو پیش کرنا ہوتا ہے۔

۴ سے ۶ تک ڈائلاگز لکھنا ہوتے ہیں

اسے ۱۹۶۰ تک مکالموں پر بحث ہوتی ہے۔ اس کے بعد کہیں چھٹی ملتی ہے ۔

زندگی اپنی جو اس طور سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بہر حال جی بے حد پریشان ہے اور دلّی کی گلیاں رہ رہ کر یاد آتی ہیں لیکن پیٹ بڑا کل صلاح الدین اور اسد کو بھی خط لکھوں گا۔ شان صاحب اور سب سے سلام کہنا۔

تمہارا ـــــــ شاہد لطیف

اس کے بعد ظفر قریشی کے پاس شاہد لطیف کا ایک خط آیا جس میں پھر عصمت سے شادی کرنے کا خیال ظاہر کیا گیا تھا۔ ظفر نے مجھے وہ خط دکھایا تو میں نے یونہی ذرا لُطف لینے کے لئے کچھ اس قسم کے مضمون کا خط عصمت کو لکھ دیا کہ چند نامعلوم وجوہات کی بنا پر شاہد لطیف پر شادی کا بھوت سوار ہے۔ لڑکی علی گڑھ پاس چاہتے ہیں۔ عمر سولہ اور تیس کے درمیان ہو لیکن شرط یہ ہے کہ مضمون نگار بھی ہو اور آپ کے پائے کی۔ آپ بھی علی گڑھ کی پڑھی ہوئی ہیں اس لئے آپ ہی سے رجوع کرنا مناسب سمجھا گیا ہے۔ امید ہے آپ اس نیک کام میں مدد کریں گی۔ عصمت کا جواب آیا۔

چغتائی منزل ـــــــ جودھپور

۴۱-۱۰-۳

اخلاق صاحب۔ وعلیکم السلام۔ بدقسمتی سے بالکل بخیریت ہوں۔ آپ کا خط ملا۔ ریگستان میں رہنے والوں کے موڈ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ نے جس معاملے میں مدد مانگی

ہے کاش کچھ کر سکوں۔ شاہد صاحب پر جو بھوت سوار ہے خدا کرے جلد اترے اور شادی کے بعد کوئی نیک نہاد بھوت نہ سوار ہو جائے۔ ان کے TERMS تو بڑے شاندار ہیں میں جلد ہی علی گڑھ جانے والی ہوں اور ہر ۱۶ اور تیس کے درمیان والے بھوت کے سامنے اُن کی شرائط پیش کر دوں گی۔ میں نے تو سنا تھا علی گڑھ میں کوئی لڑکی ہیں جنھوں نے مجھے شاہد صاحب سے ملایا تھا ان سے اُن کی بات چیت طے ہے۔ لڑکیاں تو بہت ہیں۔ خیر جیسے ہی کسی موزوں لڑکی سے ملاقات ہو گی اُس کا پتہ آپ کو بھیجدوں گی آپ خود یا شاہد ہی بات چیت طے کر لیں وہ میں ذرا اس آرٹ سے بے بہرہ ہوں۔

انھیں لکھیے کہ چھٹیوں وغیرہ میں علی گڑھ جائیں اور خود بھی بٹھکی لگائیں تو کہیں بھوت پکڑا جائے گا۔ اگر میں ہوئی تو مدد کا وعدہ کرتی ہوں۔ یا اگر ویسے ہی کوئی لڑکی اُن کے خیال میں ہو اور میری پہنچ اُس تک ہو تو کوتاہی نہ ہو گی امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے

خاکسار ـــــ عصمت چغتائی

یہ خط مجھے خلافِ توقع ضرورت سے زیادہ شاہد لطیف کے حق میں امید افزا معلوم ہوا۔ چنانچہ میں نے شاہد لطیف کو لکھ دیا کہ بات پکی ہی سمجھو یعنی "لڑکی" تیار ہے۔ اب تم اپنی کہو شاہد لطیف نے جواب دیا۔

بمبئی ٹاکیز

ملاڈ بمبئی

پیارے اخلاق یہ تم نے اپنے خط میں کیا باتیں لکھ ماریں۔ عصمت مجھ سے شادی

کرنے کو تیار ہیں۔ اماں رہنے دو۔!!

میں نے ایک خط میں یونہی ظفر کو لکھا تھا مجھے اس قسم کے دورے اکثر پڑتے رہتے ہیں بمبئی میں جب ایک آدھ رات گذار آتا ہوں۔ یا پھر یہیں ملاڈ میں" زلفیں پریشاں" ہوجانے والی بات ہوجاتی ہے تو دماغ خود بخود ٹھیک ہوجاتا ہے۔

عِصمت تو یکم اکتوبر سے بمبئی آگئی ہیں۔ میں نے سنا ہے۔ ابھی ملاقات نہیں ہوئی تم کہو تو تمہاری شادی کی بات چیت چھیڑوں۔ اس لئے کہ تمہاری شادی کے دن ہیں اور یہاں تو بقول شخصے ع" آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"

اور سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو۔ دن اور رات کس طرح گذر رہے ہیں؟ ہاں میں دسمبر میں دلی پہنچ رہا ہوں۔ کیا خاطر کروگے۔ خاطر سے جو میری مراد ہے تم سمجھ ہی گئے ہوگے۔

آج کل ہم لوگ" جھولا بنا رہے ہیں۔ لیلا چٹنس اور اشوک کمار وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ انجان دیکھا؟ کیا رائے ہے؟

اماں تم مجھے خط لکھتے کیوں نہیں رہتے۔ یہ کیا کہ ہر تین چار مہینے کے بعد ایک خط لکھ مارا اور سمجھے جیسے بڑا کام کیا۔ جواب دینا مفصل اور جلد ——— ظفر کو پیار

تمہارا ——— شاہد لطیف

مجھے شاہد لطیف کا یہ خط پڑھ کر سخت کوفت ہوئی۔ کیونکہ جن باتوں سے چلتے چلتے اُسے منع کیا گیا تھا۔ اس خط سے اندازہ ہوا کہ وہ اب انہی قصّوں میں الجھتا جا رہا ہے اور اپنے زندگی کے اُس پروگرام تک سے غافل ہوا جا رہا ہے جس کے لئے دلّی میں اُس نے" لاکھوں کے بول سہے" اور پھر وہ بھی اُس وقت جب نتیجہ خاطر خواہ پیدا ہونے کی توقع ہو چکی تھی۔

جی چاہتا تھا کہ کسی طرح سجاد حیدر، اور نذر سجاد حیدر، سید امتیاز علی تاج اور حجاب امتیاز علی تاج کی شادیوں کی یاد ایک دفعہ پھر تازہ ہو جائے اور گھڑی کی چوتھائی میں۔ چنانچہ میں نے ذرا سخت خط لکھا جس کا جواب شاہد لطیف نے یہ دیا۔

بمبئی ٹاکیز

ملاڈ : بمبئی

جانِ شاہد۔ تمہارا خط ملا ——— سن بھئی شادی بیاہ کے بارے میں میں سخت "بھانڈو" ہوں۔ حال یہ ہے کہ مجھے ہمیشہ کسی نہ کسی لونڈیا سے عشق رہتا ہے۔ چند روز تک یہ عشق اسی طرح چلتا رہتا ہے اور بعض اوقات تو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ اگر یہ لڑکی جدا ہو گئی تو جینا محال ہو جائیگا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ یہ عشق ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ زندگی میں سے یہ لڑکی FADE OUT ہو جاتی ہے اور کوئی اور اللہ کی بندی FADE IN! ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس پندرہ مہینے کے عرصے میں کم و بیش پندرہ لڑکیوں سے عشق ہو چکا ہے لیکن انجام I LOVE NO ONE AND NO ONE LOVES ME

ابھی پچھلے دنوں ایک صاحبہ ہمارا اسٹوڈیو دیکھنے آئی تھیں۔ ہمارے ہاں ایک حسن صاحب ڈائیلاگ ڈائرکٹر ہیں حسن صاحب کے اُس لڑکی کے خاندان سے کافی تعلقات ہیں۔ انھوں نے مجھ سے انھیں ملایا اور کہا بھئی شاہد تم انھیں اسٹوڈیو دکھا دو۔ چنانچہ وہ دن بھر میرے ساتھ گھومتی پھرتی رہیں۔ شام کو جب وہ چلی گئیں تو مجھے یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے میری کوئی چیز کھو گئی ہو۔ بہت سوچنے پر معلوم ہوا کہ مجھے اُن صاحبزادی سے عشق ہو گیا ہے لیجئے بیٹھے بٹھائے بُرا حال ہو گیا۔ حسن صاحب کے پاس جا کے مودب رو دیا۔ اُن سے کہا بھائی میرے میری

شادی کرادو کسی طرح اُس لڑکی سے۔ پہلے تو وہ سمجھے میں مذاق کر رہا ہوں لیکن آخر کار انھیں بھی یقین ہوا۔ انھوں نے جا کر لڑکی کی ماں سے میرا تذکرہ کیا کہ لڑکا ایم اے تک بڑھا ہوا ہے دوسو روپے تنخواہ ہے اور پچاس روپے سالانہ ترقی ہے۔ بڑی بی نے کہا مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، میں لڑکی سے پوچھ دیکھوں۔ دوسرے دن حسن صاحب نے یہی باتیں مجھے آکر سنادیں۔ میں اُسی طرح SERIOUS رہا اس لئے کہ واقعی میں طے کر چکا تھا کہ شادی کروں گا اس لئے کہ لڑکی حسین ہے، ایف اے تک بڑھی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہیے خیر تیسرے دن حسن صاحب نے بتایا کہ لڑکی شادی کرنے کو تیار ہے لیکن چاہتی ہے کہ شادی کے بعد اُسے بی۔ اے کر لینے دیا جائے۔ بھلا اس میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سب کچھ تقریباً طے پا گیا۔ اب جو سوچنا شروع کیا تو راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ سوچا بندہ خدا اس تنخواہ میں تیری اپنی گذر ہوتی نہیں، بیوی اور وہ بھی MODERN قسم کی اس کی گذر کیسے کرے گا بس کیا تھا سارا عشق ہرن ہو گیا۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے حسن صاحب سے کہا کہ بھئی ہم سے غلطی ہو گئی ہمیں معاف کر دو، اور کسی طرح اس عذاب سے نجات دلواؤ۔ انھوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور کہا، عجیب چیز ہیں آپ بھی شادی بیاہ کو بھی مذاق سمجھ رکھا ہے آپ نے، لیجئے صاحب بیٹھے بٹھائے بیکار کی سننا پڑ گئیں۔

اسی قسم کی حرکت ظفر کے ساتھ کی۔ ہر خط میں لکھتا بھئی ہماری شادی کرادو۔ اس غریب نے دلّی میں ایک جگہ طے کی تو اسے لکھا کہ بھئی ہم سچ مچ مذاق کر رہے تھے، ورنہ ہماری کیا ہمت جو شادی بیاہ کر سکیں۔ عصمت کے سلسلے میں بھی ایک دن یونہی بیٹھے بٹھائے BRAIN WAVE آئی اور ظفر کو لکھ مارا۔ اس بیچارے نے سمجھایا کہ کہیں دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے، اور ماں کی گالی دی تاکہ میرا دماغ درست ہو جائے۔ اب اس بات کو جلتے ہوئے بڑھاؤ کو لعنت ہے

تمہارے اوپر۔ اس لیئے کہ کہیں عصمت کو خواہ مخواہ کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔ میرے ان کے تعلقات اچھے خاصے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ کسی طرح خراب ہوں۔

ہاں یار گنڈہ وُزر رذرا مشکل سے ہوتی ہے۔ لیکن کیا کریں۔ تمہارا یہ خیال کسی طرح درست نہیں کہ میں بڑا آدمی ہوگیا ہوں۔ میرا خود تم لوگوں سے ملنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں کے کاموں سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔ شاید دسمبر میں ملاقات ہو سکے۔

"انجان" کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا ہے ٹھیک ہی ہے۔ آج کل "جھولا" بنا رہے ہیں ہم لوگ۔ اس کی کہانی SCREEN PLAY اور مکالمے لکھنے میں میرا کافی ہاتھ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اسے "بندھن" سے بھی زیادہ پسند کروگے۔ تمہاری عصمت آپا عورتوں کے مکالمے لکھنے میں بہت مشہور رہیں۔ ذرا "جھولا" کے مکالمے بھی سننا۔

اچھا یہ تو سب مذاق تھا اب ہم تم سے نہایت سنجیدگی سے ایک بات کہتے ہیں، یار تم کہیں ہمارا بیاہ کرا دو واقسم قرآن کی یہ مذاق نہیں ہے۔" ——— ظفر کو پیار

تمہارا ——— شاہد لطیف

اس خط کے بعد میں نے طے کیا کہ آئندہ عصمت کو کوئی ایسا ویسا خط نہیں لکھوں گا اور "گواہ چست" بننے کی بلاوجہ کوشش نہیں کروں گا۔ یہ خبر آ چکی تھی کہ عصمت صوبہ بمبئی کے لڑکیوں کے اسکولوں کی انسپکٹرس ہو کر بمبئی جانے والی تھیں۔ چنانچہ میں نے انہیں لکھ دیا کہ اگر آپ بمبئی نہ جائیں تو اچھا ہے۔ شاہد لطیف گمراہ ہوگیا ہے جس کا بے حد افسوس ہے انھیں بمبئی کی ہوا لگ گئی اور اب ہمیں ان کے شادی بیاہ کے معاملے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ کچھ عرصے بعد جب ٹھوکریں کھا کھا کر یہ حضرت ٹھیک ہو جائیں گے تو دیکھا جائے گا۔ میں غم غلط کرنے کیلیئے

فوج میں بھرتی ہو کر جانے کہاں جا رہا ہوں۔ شاید اب کبھی آپ لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکے
وغیرہ۔ دلی کے دوست بھی فی الحال چھوٹ گئے ہیں۔ آج کل میرٹھ چھاؤنی میں ہمارا پڑاؤ
ہے۔ عصمت نے اس کا جواب دیا۔

چغتائی منزل جودھپور

۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۲ء

اخلاق صاحب تسلیم۔

آپ کا خط ملا۔ میں بمبئی تو نہیں گئی ہاں پندرہ نومبر کو چلی جاؤں گی۔ جودھپور سے
دل اکتا گیا۔ شاید بمبئی سے بھی اکتا جائے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ وہاں دنیا کی اور چیزیں بھی تو
ہیں۔ وہاں میرے بھائی ہیں۔ اُن ہی کے ساتھ رہوں گی۔ وہ چلے آئے تو دیکھا جائے گا۔
سب کہتے ہیں میں غلطی کر رہی ہوں۔ خیر یہ تو پرانی شکایت ہے۔ سب کا یہی خیال ہے کہ
فہیم بھائی (فہیم بیگ چغتائی) کی طرح خانہ بدوش ہو کر رہ جاؤں گی۔ اپنے کندھوں سے
زیادہ محفوظ جگہ ایک انسان کے لئے اور کون سی ہو سکتی ہے۔

بہت اچھا کیا جو زندگی کا راستہ بدل کر جنگ کے میدان کی طرف آپ نے قدم اُٹھایا۔ موت
کمبخت ساٹھ سالوں میں بھی پہنچ جائے گی۔ کیوں نہ بجائے دلی کی سڑی ہوئی گلیوں کے نہایت
دھوم دھام سے میدانِ کارزار میں مرا جائے۔ اور کھلی ہیں سر دینے والے دھکوں سے کیوں ڈریں۔
دلی آنے کا ارادہ اب بدل گیا۔ دسمبر میں آؤں گی شاہد بھائی (شاہد احمد دہلوی مدیر ماہنامہ
ساقی) سے سلام کہہ دیجئے گا۔ امید ہے آپ میدان جنگ کے خوف سے دبلے نہیں ہو رہے ہوں گے۔

خاکسار ــــــــــ عصمت

اس کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ شاہد لطیف نے بہت زیادہ شراب پینی شروع کر دی ہے اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں جب وہ بہک بہنی دو گوش (لیسے) بانس بریلی پہنچا دیے جائیں۔ میں نے اپنے ایک پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست کے ہاتھ جو انھیں دنوں فلم میں ملازم ہوئے تھے بہت ہی چیندہ قسم کی گالیاں انھیں کھلوائیں اور احتیاطاً ایک خط بھی کچھ اسی قسم کے مضمون کا ارسال کر دیا۔ جس کا جواب آیا۔

بمبئی ٹاکیز

ملاڈ بمبئی

اخلاق پیارے۔ دعائیں

تمہارا خط ملا۔ شیخ مختار (THE ONLY WAY) نے تمہاری گالیاں ٹیلیفون کے ذریعے مجھ تک پہنچا دی تھیں اور کہا تھا کہ اگر مفصل گالیاں سننا ہوں تو کسی دن اُن کے ساتھ لنچ یا ڈنر کھاؤں لیکن مجھے اب تک فرصت نہ مل سکی۔ بہر صورت آج تمہارا خط مل گیا اور اب شاید وہاں جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔

عجیب ہنگامے کی زندگی ہے یہاں کی بھی عجیب عجیب تجربے ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں لیکن کام کی زیادتی کی وجہ سے ابھی تک بمبئی اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔

نیا ماحول ہے نئے نئے دوست ہیں۔ وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ لیکن ادھر پچھلے دنوں مجھے اس قدر سخت صدمہ پہنچا کہ اب تک سنبھل نہ سکا اور فرار کی خاطر سخت قسم کی حماقتوں میں پڑ گیا ہوں۔ نہ جانے کیا انجام ہو گا۔

میرے کنٹریکٹ کے بارے میں ظفر سے تمہیں صحیح اطلاع ملی ہے، اگر رینیو، ہو گیا تو

مبلغ بچاس روپے بڑھ جائیں گے۔

برسات کی قیامت خیزیوں کا حال احمد عباس اور نجم جو ابھی دہلی سے واپس ہوئے ہیں سن چکا ہوں۔ تم لوگوں سے ملنے کو بے حد جی چاہتا ہے لیکن یہاں کی الجھنیں نہ جانے کب ملنے دیں۔

جملہ احباب کی خدمت میں سلام پہنچا دینا۔

تمہارا ——— شاہد لطیف

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ دلی کی ہارڈنگ لائبریری میں شاہد احمد دہلوی مدیر ماہنامہ ساقی، کرشن چندر، اور روانسین کی کوششوں سے آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ شاید ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ ن۔ م۔ راشد صاحب نے مشاعرے کی نشست کا انتظام اور اسے آل انڈیا ریڈیو، دلی سے ریلے کرنے کا اہتمام کیا جس کی وجہ سے ہندوستان بھر کے ہر زبان کے ادیب اور شاعر دلی میں جمع ہو گئے۔ عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کو بھی بمبئی دعوت نامہ بھیجا گیا لیکن وہ لوگ جب آخر وقت تک نہ پلٹے تو میرا اور شان صاحب (شان الحق حقی دہلوی) کا ماتھا ٹھنکا کہ بات کچھ اور ہی ہے۔ میں نے شاہد لطیف کو لکھا کہ یہ موقعہ ہاتھ سے مت جانے دو عصمت کو لے کر فوراً دلی پہنچو یہاں سب تم دونوں کے گلوں میں ہار ڈالنے کے لئے تڑپ رہے ہیں بمبئی سے آنے والی ہر ٹرین پر تم لوگوں کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ یہ کانفرنس ایک ہفتے تک جاری رہے گی۔

اب بھی آجا کہ رمق باقی ہے

شاہد لطیف کا جواب آیا۔

۵۶۔ پاٹن والا محل
وکٹوریہ گارڈنز بمبئی

اخلاق میری جان خواب اکثر جھوٹے ہی ہوتے ہیں چنانچہ تمہارا خواب بھی جھوٹا ثابت ہوا نہ وہ ٹرین پہنچی اور نہ ادبا نے میرے اور عصمت کے گلے میں ہار ڈالے۔

عصمت اور شاہد دو متضاد چیزیں ہیں، میرا اور اس کا ساتھ ہی کیا اور پھر سفر میں ناممکن قطعی ناممکن :: لیکن جی چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ ممکن ہوتا۔ تمہارے تو عصمت سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور تم میرے دوست بھی بنتے ہو، پھر میرے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے اب بھی وقت ہے۔

اب اگر میں کہوں گا تو تم کہو گے میں تمہاری خوشامد کر رہا ہوں لیکن میں بغیر کہے رہ نہیں سکتا تم ہو نرے "تمغے" !!! سنا ہے ڈرامہ آرٹسٹ ہو گئے جیو میری جان ——— !

عصمت اس وقت میرے یہاں آئی ہوئی ہیں تمہیں پیار کہتی ہیں ——— !!

یاردتی پہنچنے کی بے حد کوشش کی لیکن چھٹی نہ مجھے ملی اور نہ عصمت کو جس کا بہت افسوس ہے۔ خدا جانے تم لوگوں سے کب ملاقات ہوگی۔ تم بمبئی کیوں نہیں آتے۔

اچھا ایک بات کہیں، ۲۰ مئی سے تم رشتے میں میرے "سالے" ہو گئے ہو، سمجھے ——— !!

تمہارا ——— شاہد لطیف

یہ خط جب مجھے ملا تو میں نے شان صاحب سے کہا کہ دیکھو جس کی ڈاڑھ میں چاول ہوتے ہیں وہ یوں چبا چبا کر باتیں کرتا ہے۔ آخر کر گزرا نا یہ شخص عصمت سے شادی۔ میرے منہ سے اس بات کا نکلنا تھا کہ محمد حمزہ صاحب دہلوی (جرنلسٹ) بھائی شاہد (شاہد احمد دہلوی)

الحاج حافظ سید وصی اشرف دہلوی (مالک کتب خانہ علم و ادب دلّی) نے مجھے بیک وقت سمجھایا کہ جب تک تحقیق نہ ہو جائے اس قسم کی بات کا منھ سے نکالنا ٹھیک نہیں۔ اسد، ظفر قریشی، صلاح الدین قریشی اور فضل حق قریشی کو اس بات کا یقین آتا بھی تھا اور نہیں بھی آتا تھا لیکن شان الحق صاحب نے مجھ سے سولہ آنے اتفاق کر لیا۔ انھوں نے جب اُسی آل انڈیا رائٹرز کانفرنس میں بیگم شائستہ اکرام اللہ، سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری وغیرہ سے اس کا ذکر کیا تو یہ بات احمد علی کے کانوں تک پہنچی اور وہ چونکہ اُسی روز بمبئی سے دلّی بذریعہ ہوائی جہاز پہنچے تھے۔ اس لئے انھوں نے انگریزی میں اس کی پرزور تردید کر دی اب ایک تو احمد علی، پھر بمبئی سے دلّی تک اُس زمانے کا ہوائی جہاز کا سفر اور اُس پر اُن کا ٹھیٹ انگریزی لب و لہجہ، ان سب باتوں نے مل کر کچھ ایسا سب پر اثر کیا کہ میں اچھا خاصا نکّو بن کر رہ گیا۔ اپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر نے اسے اس وقت قرین قیاس ہی نہ سمجھا لیکن اسرار الحق مجازؔ، جاں نثار اخترؔ اور معین احسن جذبیؔ نے کہا اگر ایسا نہیں بھی ہے تو ہو جانا چاہئے۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔

میں نے جب عصمت کو خط لکھ کر اس شادی کی تصدیق کرنی چاہی اور اپنے اشتیاق اور دوسروں کے اظہار حیرت کا ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ بعض لوگ یہاں کہہ رہے ہیں کہ آپ چونکہ شاہد لطیف سے ہر معاملے میں بلند ہیں اس لئے میرا قیاس درست ہو ہی نہیں سکتا تو ان کا جواب آیا۔

۵۶۔ پاٹن والا محل ـــــ تیسرا مالا

وکٹوریہ گارڈنز ـــــ بمبئی

اخلاق صاحب تسلیم!

آپ کا خط عرصے بعد نظر سے گذرا۔ ارے بھائی یہ بات کیا ہے جسے دیکھو مارے حیرت

کے چھت گرا جاتا ہے۔ نہ جانے کوئی گناہ کیا ہے کہ لوگ دہل جاتے ہیں یا شاید بہت ہی شاندار بات ہوئی ہے کہ گڑبڑا جاتے ہیں مجھے لفظِ شادی سے گھن آتی ہے اور میاں بیوی سے قے۔ اور شادی کی تصویریں عموماً پھاڑ ڈالنے کو جی چاہتا ہے میں اور شاہد دوست ہیں اور دوست رہیں گے۔ نہ وہ آپ کے بہنوئی اور نہ آپ اُن کے سالے۔ یہ باتیں تو پچھلے والوں کی گالیاں سی لگتی ہیں۔ رہا بلندی کا رشتہ تو صاحب ناپ تول کر دوستی کا رشتہ نہیں قائم کیا جاتا۔ ہم لوگ گاڑی کے پہیئے نہیں جو اگر چھوٹے بڑے لگ جائیں تو گاڑی اُلٹ جائے۔

اور یہ آپ بچوں کو دعا کہتے کہتے کیوں دب گئے۔ آپ کا خیال ہے میرے بچے نہیں ہیں۔ ممکن ہے آپ انھیں کیڑوں کو بچے سمجھتے ہوں جو انسان کے جسم سے رینگ کر نکلیں۔ میرے اور شاہد کے تو بہت سے بچے ہیں اور بہت سے پیدا کرنے کا ارادہ ہے ہم جو بھی کچھ سوچتے اور لکھتے ہیں وہ ہمارے جسم کے ٹکڑے بلکہ کلیجے کے ٹکڑے ہیں۔

میرے نوزائیدہ بچے "ضدی" کو آپ نے دیکھا۔ دعائے درازیٔ عمر کے متعلق کیا رائے ہے۔ رہے گوشت پوست کے بچے تو بھئی ہم لوگ بوتل مچھلیاں تو ہیں نہیں، انسان ہیں۔ یہ خدمت تو آپ مظفر میاں کے سپرد کیجئے

آپ کا خیال ہے کہ میں ضرور دُلہن ہوں اور ابھی تک گھونگٹ بھی نہیں اُٹھا صبح اُٹھ کر ساس نندوں کو سلام کرتی ہوں گی۔ توبہ! لوگ علم کے علمبردار بنتے ہیں اور دادیوں نانیوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔

یہاں کی زندگی بڑی دلچسپ ہے۔ ہم مذاق لوگوں کا جماؤ رہتا ہے۔ کاش ہم دہلی میں رہتے ہوتے۔ جلد ہی شاہد کی نئی پکچر شروع ہونے والی ہے اور بہت کچھ شیرازہ بکھر جائیگا۔

میرے بھی اسکول کھل جائیں گے۔

کیا مشغلہ رہتا ہے آپ کا۔ میں تو زیادہ وقت بکواس اور بحث میں گذارتی ہوں۔ بارہ بجے سے پہلے تو کبھی رات ہی نہیں ہوتی محفل سی گرم رہتی ہے۔

زیادہ آداب ——— عصمت

ادھر عصمت کا یہ خط آیا اور ادھر بمبئی سے آنے والوں نے عجیب عجیب وحشت ناک خبریں سنانی شروع کیں۔ عام طور پر لوگ یہ کہتے ہوئے آتے تھے کہ یہ شادی ہو تو گئی ہے لیکن نباہ نہ ہو سکے گا۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ چھوٹ چھٹاؤ ہو بھی گیا۔ عصمت نے شاہد لطیف پر اپنے تیس ہزار روپے کے مہر کا دعویٰ بھی کر دیا ہے اور یہ کہ عصمت فی الحال بددل ہو کر بمبئی سے چلی گئی ہیں اور اب شاہد لطیف اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہو کر۔ یہ افواہیں گرم ہی تھیں کہ شاہد لطیف نے لکھا:۔

سمدر دا ترنگ ——— شیواجی پارک

ماہم ——— بمبئی

بھیا!

پچھلے دو تین مہینے سے کبھی کبھی میری کمر میں دائیں طرف درد ہو جاتا تھا۔ میں نے حسب عادت کبھی پروا نہ کی۔ اب کی مرتبہ شدید دورہ پڑا۔ جب درد کسی طرح کم نہ ہوا تو شبہ ہوا کہ کہیں گردے کا درد تو نہیں ہے چنانچہ لیبارٹری میں "یورین" ٹسٹ کرایا۔ رپورٹ ملی کہ گردے میں پتھری ہے۔ اب یہ سوال ہوا کہ پتھری گردے میں کس جگہ ہے چنانچہ چھ بار مختلف قسم

کے X RAY ہوئے اور معلوم ہوا کہ دائیں گردے میں دو انگل کے برابر ایک پتھری ہے۔
ڈاکٹر ہالیگا یہاں کا سب سے اچھا سرجن ہے۔ اس نے رائے دی ہے کہ جتنی جلدی اپریشن کرالو اچھا ہے ورنہ آگے چل کر سخت تکلیف ہوگی۔ اس نے کہا کہ اگر یہ پتھری مثانے میں ہوتی تو شاید اس کے گھل جانے کے کچھ امکانات بھی تھے لیکن گردے کے پاس ہونے پر یہ کسی طرح بھی نہیں گھل سکتی۔ بہرصورت بیٹھے بٹھائے کوئی تین سو کی چپت پڑگئی۔ اب پندرہ بیس دن کے بعد اپریشن کرانے کا ارادہ ہے ایک ہزار کا یہ خرچ ہے لیکن شکر ہے کہ آج کل کچھ پیسے ویسے کمائے تھے جو اس مصیبت میں کام آجائیں گے مجھے اپریشن کراتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ تم ذرا دہلی کے کسی اچھے حکیم سے معلوم کر سکتے ہو کہ یونانی طب میں کوئی ایسی مجرب چیز ہے جس سے پتھری گھل سکے؟

عصمت کو میں نے گذشتہ مہینے یہاں گرمی زیادہ ہونے کی وجہ سے جودھپور بھیجدیا ہے۔ اپریشن کے وقت بلانے کا ارادہ ہے۔

تمہارا ——— شاہد لطیف

اس کے بعد ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یا تو شاہد لطیف اور عصمت کو دلی ہی بلا کر رکھا جائے یا پھر ہم سب کو بمبئی میں پھڑ جانی چاہیئے کیونکہ برا چاہنے والے عصمت اور شاہد لطیف میں پتہ نہیں کیا کیا غلط فہمیاں پیدا کرادیں اور واقعی کہیں یہ شادی گڑبڑ نہ ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ شاہد لطیف کو فلمی گانوں کی زبان میں لکھا کہ "یا ہم کو بلا بھیجو یا آپ چلے آؤ" اور "بھلانا نہ، یاد کرو نہ کرو" وغیرہ۔ شاہد لطیف نے جواب دیا۔

میری جان۔ آخر ایسے MYSTERIOUS قسم کے خطوں کے معنی کیا ہیں؟ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف اور کھل کر کہو، تمہیں ڈر کس کا ہے۔ تمہارے پہلے خط کا جواب دے چکا ہوں آج یہ دوسرا شکایتی رقعہ ملا۔ میری جان میں اپنے دوستوں کو کبھی نہیں بھولتا۔

امید ہے اگلے خط میں تم مجھے مفصل باتیں لکھو گے۔

تمہارا اپنا ــــــ شاہد لطیف

اس کے فوراً بعد یہ سننے میں آیا کہ شاہد لطیف کی نوکری چھوٹ گئی بمبئی ٹاکیز ٹوٹ گئی دو پارٹیاں ہو گئیں ایک پارٹی فلمستان کے نام سے اپنا کام شروع کرے گی اور شاہد لطیف فلمستان میں اب صرف ٹائپ کے کام پر رکھے لئے جائیں گے اور اس کی تھوڑی بہت تصدیق شاہد لطیف کے ایسے خط سے ہوئی جس پر لکھا تھا "مجھے ٹائپ کرنا سکھاؤ" سخت پریشانی ہوئی۔ خیر ٹائپ کرنے کا ابتدائی سبق اُن کو لکھ کر بھیجدیا گیا اور میراجی جو انہی دنوں بمبئی جانے والے تھے اُن سے کہا کہ ذرا جا کر خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر لکھیئے کہ یہ آخر کر کیا رہے ہیں۔ اِدھر میراجی بمبئی پہنچے اور اُدھر شاہد لطیف کا خط آیا۔

برخوردار۔ تمہارا خط ملا۔ ٹائپ کے بارے میں جو تم نے ہدایات لکھی ہیں وہ میری تو سمجھ میں آتی نہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم نے میرے لئے تعویذ بھیجا ہے لیکن میراجی کی زبانی معلوم ہوا کہ کچھ ٹائپ رائٹر کے بارے میں ہے

تمہارے بمبئی آنے کے بارے میں میں مفصل ظفر کو لکھ چکا ہوں تم ظفر سے میرا وہ خط لے کر پڑھ لینا۔

خط نہیں لکھا جاتا۔

تمہارا ——— شاہد

تاریخ تو خیر کسی خط پر شاہد لطیف نے لکھنی سیکھی ہی نہ تھی لیکن اب اس نے خطوں پر ڈاک کا پتہ بھی لکھنا چھوڑ دیا تھا اس لئے کچھ برے برے خیال آنے شروع ہوئے اور میں نے سوچا نصیب دشمناں کوئی پیر اونچا نیچا تو نہیں پڑ گیا۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ شاہد لطیف کا خط آیا۔ جس پر حسبِ معمول تاریخ تو نہ تھی لیکن پتہ ضرور تھا۔

نوروگ چترپٹ لمیٹڈ

شنکر شٹ روڈ۔ پونہ

اخلاق!

میں پونہ ڈائرکٹر ہو کر آگیا ہوں تین ہزار روپیہ ماہوار پر۔ ان لوگوں نے مجھے اسٹوری سناریو اور ڈائیلاگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بھی بنا دیا ہے۔ میں نے یہاں آتے ہی تمہارے اور ظفر کے لئے جگہ پیدا کرنے کی کوشش کی اور مجھے کامیابی بھی ہو گئی۔ دو جگہیں SANCTION ہوئی ہیں۔ ایک چار سو روپے ماہوار کی دوسری تین سو کی۔ چار سو والی کے لئے میں نے ظفر کو لکھا ہے۔ تین سو والی تمہارے لئے ہے۔ تم اگر آنا چاہو تو لکھو۔ تھوڑا بہت RISK ضرور ہے لیکن بغیر RISK لئے ترقی نہیں کی جا سکتی۔ ظفر کو بھی سمجھانے کی کوشش کرو۔

میں آج کل بہت مصروف ہوں۔ بھائی شاہد سے میرا سلام کہنا۔ میں ان کو بھی خط لکھوں گا۔ دو چار روز کے بعد۔ خط کا جواب دو۔ اگر تم لوگ آنے کو تیار نہ ہوئے تو پھر

میں کسی اور کو لے لوں گا۔ کیونکہ مجھے کام فوراً شروع کرنا ہے۔

تمہارا ــــــــــ شاہد لطیف

میں نے جب کتب خانہ علم و ادب ہر یہ خبر توڑی کہ میاں شاہد لطیف تین ہزار روپے مہینے پر فلم ڈائرکٹر ہو گئے اور یہ بھی احتیاطاً ساتھ ہی عرض کیا کہ عصمت نے اُن کی شادی بھی ہو گئی ہے تو وہ لوگ جنھوں نے شاہد لطیف کے اس عزم کو اب سے کچھ ہی عرصہ پہلے

این خیال است و محال است و جنوں

کہہ کر ختم کرنا چاہا تھا۔ بہت برافروختہ ہوئے اور کہا ایسی بادہوائی باتوں پر ایمان نہیں لانا چاہئے لوگ "فلموں" میں جا کر ایسی ہی بے پر کی اڑاتے ہیں بھلا تین ہزار روپے مہینہ بھی آج تک کسی ادیب کو ملا ہے۔ اُتنی تنخواہ تو پطرس بھی نہیں لیتے اور ابھی یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ سچ مچ عصمت چغتائی نے شاہد لطیف سے شادی کر ہی لی ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ شاہد لطیف کے خطوں سے ان "احباب" کی خوش فہمیوں کی مطلق کسی عنوان تصدیق نہیں ہوتی تھی وہ لکھے جا رہا تھا۔

نربوگ سٹوڈیوز

سنگرشنت روڈ پونہ ۲

اخلاق میری جان آج ہماری پکچر کی مہورت تھی جمہورت یعنی آج پکچر شروع ہوئی ہے۔ مہورت کے بعد زبردست قسم کی پارٹی ہوتی ہے جس میں ہر قسم کی حرکتیں ہوتی ہیں۔ ان حرکتوں کا اثر میرے اس وقت کے UNSTEADY HAND WRITING

پر دیکھ سکتے ہو۔ اس وقت رات کے تین بجے ہیں اور میں تمہیں اس حالت میں خط لکھ رہا ہوں کہ سر میں سخت درد ہے۔ خدا جانے کہاں کہاں درد ہے۔ تمہارا "تار" ملا، آج اُس "ٹیٹے" کا جسے لوگ ظفر قریشی کہتے ہیں خط ملا میں نے خط کے خاص خاص حصے اپنے MANAGING DIRECTOR کو سنا دیئے۔ سمجھ میں تو کیا آئے ہوں گے ان حضرت کے لیکن وہ دانت کچھ اس طرح نکوستے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ مولوی عبدالحق نے جو رسالہ "اردو" میں ایک مقالہ لکھا تھا "فارسی زبان کا مرہٹی زبان پر اثر" وہ غالباً کافی تحقیق کے بعد لکھا ہوگا کیونکہ یہ حضرت مرہٹے ہیں، اردو بولتے نہیں، اردو بولنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ ان حضرت نے خط وغیرہ سننے کے بعد کہا "اگر تم منگتا ہے اس جنٹلمین کو ہم بھی لیں کہتا ہے" مطلب یہ کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا بہتر ہے اس ڈر سے کہ کہیں یہ حضرت اپنی رائے بدل دیں۔

کل میں تم لوگوں کا معاملہ طے کرنے کے لئے بمبئی جا رہا ہوں۔ اس لئے کہ یہاں تو تم لوگوں کا معاملہ طے ہو گیا لیکن ابھی ان داتا نے ہاں نہیں کی ہے۔ ہر کمپنی کا ایک ان داتا ہوتا ہے۔ یہ ان داتا کچھ اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں کہ جب تک انہیں تقین نہ ہو جائے کہ یہ ایک کا سوا وصول کر لیں گے کسی کو ایک روپیہ نہیں دیتے۔ مجھے اسی ان داتا نے ملازمت دی ہے اس لئے میں اُس سے مل کر معاملہ طے کر لوں گا اور جلد از جلد تم کو "آفر" بھجواؤں گا۔ تم کوشش کرو کہ تمہیں چند مہینے کی چھٹی مل جائے۔ اگر نہ ملے تو مجبوری ہے۔ تمہاری طرف سے مجھے پریشانی نہیں۔ ڈر ہے اُس ظفر قریشی کا کیونکہ وہ ہر پانچ منٹ کے بعد مجھے اپنے ایک بڑے کنبے کے سرپرست ہونے کی دھمکی دیا کرے گا۔

میں تمہیں DIALOGUE DIRECTOR کی حیثیت سے بلانا چاہتا تھا اُس میں خرابی

یہ ہے کہ تم زیادہ ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لئے تم آکر کچھ اس طرح POSE کرنا کہ نہایت ہی
شاندار قسم کے ادیب ہو سینکڑوں کتابیں لکھ چکے ہو اور آل انڈیا ریڈیو محض تمہاری وجہ
سے چل رہا ہے وغیرہ وغیرہ

میں نے تم لوگوں کے بارے میں بھائی شاہد کو بھی ایک خط لکھا ہے۔ اس کا مضمون
وہ تمہیں بتائیں گے۔ اس پر ذرا غور کر لینا۔

میرے اس خط کو اور جو شاہد بھائی کو لکھا ہے صحیح اسپرٹ میں لینا۔

تمہارا ——— شاہد

پھر خط آیا :-

آدام بنگلہ

کھرادادی پونہ ۱۲

اخلاق !

نیوگ لمیٹڈ کمپنی ہے۔ اس کا ہیڈ آفس بمبئی میں ہے۔ بورڈ کی میٹنگ ابھی پچھلے دنوں
وہاں ہوئی تھی۔ اس میٹنگ میں تم لوگوں کے تقرر کا سوال بھی پیش ہونے والا تھا لیکن ایجنڈا
کچھ اتنا لمبا چوڑا تھا کہ تم لوگوں کا سوال پیش نہ ہو سکا۔ اگلی میٹنگ سات اگست کو
ہونے والی ہے اس لئے یہ سوال فی الحال اس وقت تک کے لئے ٹل گیا۔

میں غالباً اس مہینے کے آخری ہفتے میں دہلی پہنچوں گا مفصل باتیں اس وقت ہوں گی۔

ظفر کا ایک تیا پے کا خط ملا تھا۔ اس کو بھی یہی خط دکھا دینا تین چار دن سے
سخت بخار اور گردے میں درد ہے۔

شاہد

اِدھر تو شاہد لطیف کے اس قسم کے خط آ رہے تھے اور اُدھر لوگ بڑے ذوق کر یہ خبریں سنا رہے تھے کہ شاہد لطیف اور عصمت میں ناچاقی ہو گئی یا ہونے کو ہے اور ادیبوں کا ایک گروہ تو ایسا تھا جو کسی طرح اس شادی کو تسلیم ہی کرنے پر رضامند نہ ہوتا تھا کہ یکایک "لحاف" کے سلسلے میں عصمت پر مقدمہ کھڑا ہو گیا اور شاہد لطیف اور عصمت کو بہ نفسِ نفیس مقدمے کی پیروی کے لئے لاہور براہِ دہلی آنا پڑا۔ دلی میں یہ لوگ بھائی شاہد کے ہاں دو ایک روز مقیم رہے جس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ شادی ہو چکی ہے لیکن یہ پھر بھی ثابت نہ ہو سکا کہ نباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ شاہد لطیف نے بتایا کہ جب سے شادی ہوئی ہے کوئی دن خالی نہیں گیا کہ گھر میں محفل میلاد منعقد نہ ہوئی ہو۔ روزانہ مولود شریف ہوتا ہے اور محلے بھر کی وہ سب عورتیں جمع ہوتی ہیں جو دھوبیا برانڈ کے میلی چندیوں کے سفید برقعے اوڑھ کر آتی ہیں اور برقعے ہی اوڑھے وہ ان مجلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ یہ عورتوں کی وہ قسم ہے جو اپنے گھر میں اپنے شوہر کے سامنے بھی یہ برقعہ نہیں اتارتیں۔ اور جو عصمت سے کہو کہ بھئی یہ کیا تماشہ ہے آخر۔ تو وہ کہتی ہیں کہ آپ کی مصروفیتوں میں جب میں مخل نہیں ہوتی تو آپ میری دلچسپیوں میں کیوں حائل ہوتے ہیں اور پھر یہ کہ گھر کی دیواروں پر جگہ جگہ "ان اللہ علیٰ کلِ شئی قدیر۔" "کل نفسٍ ذائقۃ الموت اور اسی قسم کے بے شمار طغرے لگے ہوئے ہیں۔ تصویروں میں زیادہ سے زیادہ ترکوں اور فرنگیوں کی جنگ کے نقشے ہیں۔ غرضیکہ گھر میں اور محرم کی سبیل میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے۔ ضد یہ ہے کہ جب تک تم راتوں کو اسٹوڈیو میں کام کرو گے۔ دن بھر گھر میں یہی رہے گا۔ سینما اگر جاؤ تو یہ لاؤ لشکر بھی ساتھ ہوتا ہے میلی چندیوں کے برقعے۔ اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ یہ نعت خوانی کر کر کے نڈھال ہو ہو جاتی ہیں

اس لئے کچھ تو ان بے چاریوں کی تفریح کا بھی سامان ہو اور یہ آخر کہاں اپنا دل بہلائیں۔ چنانچہ ایک سینما شو کا مطلب میرے لئے ہوتا ہے ڈھائی تین سو روپے کیونکہ پونہ سے بمبئی تک سب کا فرسٹ کلاس کا سفر، بمبئی میں ایک رات کسی اچھے ہوٹل میں سب کا قیام اور کھانا پینا وغیرہ اور پھر اسی اہتمام سے پونہ واپسی۔ شاہد لطیف نے کہا اس روز روز کے ہنگامے سے میں تنگ آگیا ہوں اور اب میرا ارادہ فلم چھوڑ کر ریڈیو میں آنے کا ہے چاہے تم اسے اُلٹے بانس بریلی بھجوانا سمجھو یا کچھ، رات میں صرف اسی صورت میں گھر پر گذار سکتا ہوں اور یہ کہ میں خود بھی راتوں کو جاگ جاگ کر اس زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ بھٹ بڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ لاہور سے جب میں واپس آجاؤں تو میرے لیے آل انڈیا ریڈیو دلی میں کسی ملازمت کا انتظام کر رکھنا۔ میں اب بمبئی واپس نہیں جاؤں گا۔ یہ گفتگو کر کے جب شاہد لطیف اور عصمت مقدمے کی پیروی کے لئے لاہور چلے گئے تو کتب خانہ علم و ادب پر یہ بحث شروع ہوئی کہ کیا ریڈیو میں شاہد لطیف کو اتنے ہی پیسے مل جائیں گے جتنے فلم میں ملتے ہیں۔ شاہد لطیف کو اس وقت پانچ ہزار روپے ماہوار فلم میں مل رہے تھے اور انھیں دنوں بیس ہزار روپے کی ان کی ایک کہانی بکی تھی۔ بڑی بحث و تمحیص کے بعد متفقہ طور پر یہی طے پایا کہ شاہد لطیف کو واپس بمبئی جانے پر مجبور کیا جائے۔ ابھی عصمت اور شاہد لطیف لاہور پہنچے ہی تھے کہ بعض احباب نے دلی خط بھیجنے شروع کیے کہ جس مقدمے کے لئے عصمت یہاں آئی ہیں اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔ یہاں ان کا اپنا ہی مقدمہ درپیش ہے جس کا فیصلہ مقدم ہے بس صبح شام میں طلاق ہوا چاہتی ہے لیکن شاہد لطیف کا جو خط آیا اس سے اس قسم کی کوئی تشویش ظاہر نہ ہوتی تھی۔

معرفت لقمان حیدر

اسسٹنٹ کرنسی آفیسر

ریزرو بینک آف انڈیا لاہور

اخلاق! آج مقدمے کی پہلی پیشی ہوئی۔ کم سے کم تین چار دن تک یہ سلسلہ چلے گا۔ یہ خط عصمت لکھوا رہی ہیں۔ ریڈیو کا معاملہ تیار رکھنا۔

تمہارا ــــــــ شاہد لطیف

جب عصمت اور شاہد لطیف لاہور کے مقدمے سے فارغ ہو کر واپس دلی آئے تو حقیقت یہ کھلی کہ بھائی شاہد کے مشورے سے پہلے سب میاں ایم۔ اسلم کے ہاں ٹھہرے تھے لیکن جب میاں صاحب نے عصمت کو نصیحتیں کرنی شروع کیں اور کہا کہ مرحوم عظیم بیگ چغتائی کو میں اپنا بھائی سمجھتا تھا اور وہ جب کبھی لاہور آتے، میرے ہاں ہی ٹھہرتے اور اس رشتے سے تم میری چھوٹی بہن ہو میں اور میری چھوٹی بہن کو ایسی چیزیں نہیں لکھنی چاہئیں جس سے عدالت کچہریاں چڑھنے کی نوبت آئے اور یہ کہ شریف بہو بیٹیوں کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ جس کا جواب عصمت نے یہ دیا کہ ارادہ تو شروع میں میرا بھی یہی تھا کہ چڑے چڑیوں کی کہانیوں سے آگے نہ بڑھوں گی لیکن آپ کی "گناہ کی راتیں" پڑھ کر بہک گئی۔ تو شاہد لطیف نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ بھائی شاہد کے ساتھ مستقل میاں ایم۔ اسلم ہی کے ہاں قیام رکھا جائے۔ چنانچہ کسی اور دوست کے ہاں جا کر ٹھہر گئے۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوا اور پھر جب شاہد لطیف نے پوچھا کہ خیر لوگ تو جو منہ میں آئے گا کہیں گے ہی۔ یہ بتاؤ کہ تم لوگوں نے ریڈیو اسٹیشن میں میرے لئے کوئی جگہ پیدا کی تو ہم نے کہہ دیا کہ

یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ واپس جاؤ۔ چنانچہ یہ لوگ واپس چلے گئے۔

بمبئی گئے ان لوگوں کو کچھ ہی دن ہوئے کہ بمبئی سے ایسے آنے والوں نے جن کا

مزاج تھا کہ ع بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

یہ خوش خبری سنائی کہ علیحدگی ہو گئی اور عصمت تو اب کوئی رسالہ نکالنے کی فکر میں ہیں لیکن

اس رسالے ہی کے سلسلے میں عصمت کا خط آیا تو سمجھ میں نہ آیا کہ اس قسم کی خبریں آخر کس نیت

سے تصنیف کی جاتی ہیں۔ لکھا تھا۔

دفتری بلڈنگ

ملاڈ بمبئی

۱۴-۱۰-۴۳

اخلاق صاحب

ایک غرض پوری کیجیے۔ یعنی جو پہلے نہیں کیا وہ گناہ میری خاطر کیجیے (خدا درگزر کرے گا)

یعنی ایک مضمون لکھیے۔ یہ مجھے شاہد نے بھڑکایا ہے کہ آپ بھی مضمون لکھتے ہیں گو کہیں چھپواتے

نہیں۔ لہذا ایک لکھا ہوا ہو تو بھیج دیجیے۔ ورنہ لکھیے۔ جی ہاں اسے حکم سمجھیے یا التجا مگر لکھیے۔ بات یہ

ہے کہ مجھے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ چند نئے لوگوں کے تازہ مضمون گھول کر پیوں۔ آپ یقین نہیں کرتے

تو نہ کیجیے مگر لکھ تو دیجیے۔ بات یہ ہے کہ شامتِ اعمال ایک رسالہ "ناجو" ایڈٹ کر رہی ہوں

اُس کے لئے مضمون چاہیے۔ واضح رہے قوم اور ملک کی خدمت نہیں صرف اپنی VANITY

کو سراہنے کے لئے یہ جھنجٹ پھیلایا ہے۔ لہذا مضمون چاہیئے ہے۔ یہ میں نہیں جانتی کہاں سے۔ فقط

عصمت

میں نے ایک مضمون بھابی کو بھیج دیا جس کا عنوان تھا "دو روپے پندرہ آنے" مضمون دیکھ کر عصمت نے لکھا۔

دفتری بلڈنگ

ملاڈ بمبئی

۲۲ - ۱۰ - ۴۳

پیارے دیور صاحب مضمون بلا عنوان اس قدر گمراہ ہے کہ اگر نادلیں لکھی جائیں تو بھی تہہ نہ ملے یوں کیجیے کہ اس عنوان کو برباد نہ کیجیے۔ بہت ہی لطیف چیز لکھی جا سکتی ہے معلوم ہوتا ہے آپ لکھتے لکھتے شرما گئے۔ اور بنانے والی بات ٹال گئے۔ آپ اسٹیشن گئے وہاں سربند پارسل ملی پھر؟ پھر کیا ہوا، یقین مانیے آپ کی عزت پر حرف نہ آئے گا۔ آپ بتا دیجیے کہ پھر کیا ہوا۔ یوں بات موڑ توڑ کر گول کر گئے۔ آپ نے مضمون بہت اچھا لیا ہے یعنی دواؤں کے اشتہارات کی وجہ —— یہی "سربند پارسل"۔ ان دونوں نکات کو ایک لڑی میں بند دیجیے۔ دیکھئے اگر میں اس مضمون کو لکھتی تو سربند پارسل سے ملنے تک تو یہی مضمون رکھتی اور اس کے بعد تھوڑی سی مضمون نگار کی ناتجربہ کارانہ گھبراہٹ "پارسل" کی طنزیہ مسکراہٹیں وغیرہ جب وہاں سے رہائی ہوتی تو وہی دلال ایک شیشی دکھاتا تیر بہدف دوا۔ جملہ بیماریوں کا شرطیہ علاج "دو روپے پندرہ آنے"۔ مطلب یہ کہ لوگ ایک طرف تو بیماریاں بیچتے ہیں اور دوسری طرف دوائیں۔

یوں تو میں اسے ایسا ہی چھپوانے کو تیار ہوں مگر آپ ہی کا نقصان ہے۔ اتنا عمدہ TOPIC برباد ہو جائے گا۔ کاش میں لکھ سکتی اس پر۔ مگر اندازہ لگانے اور اصل تجربہ میں

بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں خدانہ کرے آپ کے اوپر الزام لگا رہی ہوں توبہ!

امید ہے کہ آپ دوبارہ اس کو لکھیں گے۔ پالیٹکس نہ لائیے، خود اپنی ہستی کو اس مضمون میں زیادہ گھسیٹئے، یہ مضمون میں نے رکھ لیا ہے۔ اگر آپ نے نہ بھیجا تو مع اعتراض چھپ جائے گا۔ لہذا فوراً دوبارہ لکھ بھیجئے۔ مانا کہ یہ زبردستی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مجبوری ہے۔ شاہد کام میں غرق ہیں۔ آپ کی دعائیں پہنچا دوں گی۔

زیادہ آداب ——— عصمت

میں نے جواب دیا کہ مضمون واپس بھیجدیجئے" ساقی" جب دوبارہ نکلے گا۔ اس میں اسی طرح چھپ جائے گا۔ میں اس مضمون کو" کالی شلوار" نہیں پہنانا چاہتا، وغیرہ یا پھر جیسا یہ مضمون ہے ویسا ہی آپ چھاپ دیجئے۔ اعتراضات میں خود بھگتتا رہوں گا۔ عصمت نے اس پر لکھا۔

دفتری بلڈنگ

ملاڈ بمبئی

۴ - ۱۰ - ۴۳

اخلاق صاحب۔ خیر جیسی آپ کی مرضی۔ تو یہ مضمون یونہی چھپنے جاتا ہے۔ آپ" کالی شلوار" "پیلی شلوار" نہیں لکھنا چاہتے تو نہ لکھیے مگر یہ واضح رہے کہ یہ مضمون کچھ پیاسا سا رہ گیا۔ اب دوسرا کب بھیجیں گے۔ میں تو ایڈٹ کرنا چھوڑ دوں گی اگر آپ نے کچھ مدد نہ کی۔ یہ سب شاہد کے بھڑکانے سے کر رہی ہوں۔ خود تو یہ شخص بالکل سو گیا ہے

خیر ایک تازہ مضمون لکھا ہے انھوں نے بھی جو جنوری کے پرچے میں چھپ جائے گا۔
سنا ہے "ساقی" پھر لوٹ رہا ہے۔ کاش یہ خبر سچ ہو۔ اس کمبخت "ساقی" سے نہ جانے کیوں
لگاؤ ہے۔ خدا قسم اس کے نام سے ہی مضمون سوجھنے لگے۔ آج کل تو ناول پھر شروع کر دیا ہے۔
اور کیا لکھے جاؤں، خدا حافظ!"

فقط۔۔۔ عصمت

نوٹ: ہاں جناب "بھابی" کیا شے ہوتی ہے۔ مانا آپ کو شاہد زیادہ عزیز ہیں اور
انھیں کی طرف سے یہ رشتہ لگانا فخر سمجھتے ہیں اور مجھے بہن لکھتے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر میں
بھی پھر آپ کو آپ کی ہونے والی بیوی سے رشتہ لگا کر "اخلاق دولھا" نام رکھ دونگی
شادی جب ہو گی تب ہو گی خطاب آج ہی مل جائے گا۔

فقط۔۔۔ عصمت

لیکن اس خط وکتابت کے باوجود آج تک میری نظر سے نہ تو "سماجور" نام کا کوئی
ماہنامہ گذرا اور نہ کوئی اور ایسا رسالہ جسے عصمت ایڈٹ کرتی ہوں۔ ریڈیو والوں
کی فرمائش پر کچھ عرصے بعد عصمت نے ریڈیو کے لئے لکھنا شروع کر دیا اور پھر ٹیڑھی لکیر
کے مکمل کر لینے کے بعد سیدھا باندھ کر بھائی شاہد کے ہاں دلی آکر ٹھہریں۔ سیما اُس وقت
پانچ مہینے کی اُن کی گود میں تھی۔ دو ایک دن کے بعد شاہد لطیف بھی آدھمکے۔ اس مرتبہ
پھر وہی ریڈیو کی لو لگی ہوئی تھی۔ حالانکہ فلم میں سات ہزار روپے ماہوار پر ملازم تھے۔
اور کچھ ہی عرصے بعد دس ہزار ماہوار ہونے والے تھے۔ بہ مشکل تمام پھر دونوں کو
گھسیٹا ہٹی دے کر واپس فلم میں بھیجا گیا۔ تعلقات اس مرتبہ دونوں کے بہت ہی خوشگوار
تھے۔ صرف وہ میلا دخواتی کی شکایت بدستور تھی اور وہی محرم کی سبیل کی قطع کے

گھر سے مفر نہ تھا۔ شاہد لطیف کا خیال تھا کہ ریڈیو کی ملازمت سے ان سب باتوں کا مداوا ہو جائے گا لیکن ہم نے اُن کی اس معاملے میں ایک نہ سنی آخر بے چارہ شاہد لطیف اُسی دس ہزار روپے ماہوار پر قناعت کر کے بمبئی چلا گیا۔ عصمت ریڈیو کے لئے لکھتی رہیں۔ ایک خط آیا۔

دفتری بلڈنگ

ملاڈ بمبئی

۲۲ - ۴ - ۴۴

ڈیر اخلاق

خط ملا۔ قطعی جی نہ جلا۔ آج ڈرامہ بھی مل گیا۔ حسب وعدہ شکریہ نہیں ادا کرتی کیونکہ اعتراض ہوگا جناب کو۔ بھٹناگر صاحب کہاں چلے گئے۔ بھئی مجھے خود تو اپنے لئے ریڈیو کی نوکری قطعی خطرناک نہیں معلوم ہوتی کیونکہ میرے مزاج میں انتہا کا تلون ہے۔ مگر شاہد کیلئے مجھے کبھی یہ نوکری پسند نہ تھی لیکن شاہد کو ضد تھی۔ آپ لوگوں کی محبت چرائی تھی اور میں نے اُن کی مخالفت بے کار سمجھی۔ ویسے نوکری نہ ملنے پر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

ہاں وہ دہلی کے پروگرام کے لئے مضمون کا حکم تو ملا تھا۔ مگر آج کل موڈ نہیں ہے دوسرے لفظوں میں لکھنے کا دورہ نہیں پڑا ہوا ہے۔ کوشش کی کبھی آج تک کوشش نہیں کی۔ پھر بھی "باجی" سے کہیئے گا جوں ہی قلم چلے گا پہلے ان کی فرمائش پوری ہوگی۔ کیا بتاؤں آج کل زبان تیزی سے چل رہی ہے۔ لہذا قلم سہما ہوا ہے۔ ارے بھئی یہ شاہد بھائی سے کیسی تلخی پیدا ہو گئی۔ آپ کو شاید کچھ علم ہوگا۔ میری غلطیوں سے معاملہ بہت بگڑ گیا اور وہ

ناول جسے میں مفت چھپوانے کے لئے بے قرار تھی اوندھی پڑی ہے مجھے نہ شوق اور نہ خوشی، ایک طرح کی اوس سی پڑگئی ہے۔ شاہد بھائی کو از حد غصہ آ رہا ہوگا۔ مگر یہاں بھی اصولوں کا معاملہ آن پڑا ہے۔

اور کیا لکھوں

فقط — عصمت

غرضیکہ غدر ۱۹۴۷ء تک یونہی شاہد لطیف اور عصمت سے خط و کتابت چلتی رہی اور اُن کے جو فلم تیار ہو کر آتے رہے ان پر حسب وعدہ تبصرہ کیا جاتا رہا۔ لیکن غدر ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک عصمت کی لکھی ہوئی اور شاہد لطیف کی ڈائرکٹ کی ہوئی ہر تمثیل کو دیکھنے کی تمنا ہی رہ جاتی ہے کیونکہ نہ تو سب پہلے کی طرح ایک جگہ ہی رہے اور نہ شاہد لطیف کو ان تبصروں کی ضرورت ہے۔ اسد دلّی میں ہیں، ہم لاہور میں، ظفر قریشی، شان الحق، صلاح الدین قریشی اور فضل حق قریشی کراچی میں اور سب شاید اپنی اپنی جگہ یہی سوچتے ہوں گے کہ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے۔

بہرحال شاہد لطیف اپنے عزم میں پوری طرح کامیاب ہیں عصمت کہانیاں لکھتی ہیں وہ ڈائرکٹ کرتے ہیں اور ایک اُن کی خوبصورت بچی ہے سیما۔ لیکن آج بھی کچھ لوگ اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔

(ماہنامہ نقوش، ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۲ء)

مصنف کی تلاش میں

ایک مرتبہ ایک ایڈیٹر صاحب نے اپنے رسالے کے لئے مجھ سے مضمون مانگا اور کہا مضمون ایسا ہو جس میں کمیونسٹوں کی مذمت ہو، مذہبی اور سیاسی پیشواؤں کی مخالفت ہو۔ دیسی فلم انڈسٹری کی تحقیر ہو اور فلاں قسم کے ادب اور فلاں فلاں ادیبوں پر پیروڈی ہو۔ میں نے معذرت پیش کی تو انھوں نے فرمایا کہ پھر کسی اور سے اس قسم کا ایک مضمون لکھوا کر آپ کے نام سے شائع کر دیا جائے گا۔ یہ حربہ اڈیٹر صاحب کا ایسا تھا کہ میں انکار کی جرأت نہ کر سکا۔ قہر درویش بر جان درویش کے مصداق تعمیل ارشاد کرنی پڑی اور ے

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

قسم کا ایک مضمون ان کے رسالے کے لئے لکھنا پڑا۔ حضرت امیر خسرو سے لے کر یا اس سے بھی پہلے سے اب تک کچھ اسی نوع کی افتاد جب تک کسی لکھنے والے پر نہ پڑے شاید ہی کوئی قلم اُٹھاتا ہو، یا پھر لکھنے والے عام طور پر اس وقت تک خامہ خوں چکاں اپنا نہیں کرتے جب تک کہ انھیں کسی خاص سیاسی یا مذہبی نوع کے کسی مسلک کی تبلیغ یا تکذیب منظور نہ ہو۔ نتیجہ یہ کہ ادب برائے ادب‘ یا

شدھ ادب کو آنکھیں ترستی ہیں اور اگر کہیں ایسا ادیب یا ادب مل جائے تو آنکھوں سے لگانے کو جی چاہتا ہے۔ میراجی فطرتاً اور طبعاً اسی قسم کے جوہر قابل تھے یعنی فن برائے فن کے قائل، گو عمر بھر ان بر امیر خسرو کے سے وقت پڑتے رہے لیکن پھر بھی جب کبھی انھیں موقع ملا انھوں نے شدھ ادب کی خدمت سے گریز نہ کیا۔

میراجی کی آنکھیں بند ہونے سے نہ صرف یہ کہ بعض اُن کے قدر دانوں کے نزدیک ادب ایک طرح سے یتیم ہو کے رہ گیا بلکہ بہت سے ان کے دوستوں اور ملنے والوں کو ناقابل بیان مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بہت کم لکھنے والے ایسے ہیں جن کا کوئی طرزِ نگارش ہو اور اس سے بھی کم جن کی تعداد نہ ہونے کے برابر سمجھنی چاہیے ایسے ہیں جو صاحبِ طرز لکھنے والوں کے اسلوب میں اگر لکھنے پر آجائیں تو خود وہ حضرات تمیز نہ کر سکیں جن کی طرزِ نگارش میں کوئی چیز وہ لکھ دیں۔

میراجی کے چھوٹے بھائی ایم۔ آئی۔ یو لطیفی صاحب نے ایک مرتبہ میراجی کا ایک ایسا شعر سنایا جو انھوں نے حاجی لق لق کے رنگ میں کہا تھا۔ شعر ہے ؎

زباں سے کہہ نہیں سکتا کسی کا باپ ہوں میں
کہ اپنی نسل کے نقرے کا فل سٹاپ ہوں میں

ایک دن میں نے میراجی سے کہا کہ جس نثر نگار نے یہ معرکتہ الآرا ادب پیش کیا ہے کہ گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے وہ اگر شاعر ہوتا تو اس مضمون کو کیوں کر باندھتا۔ میراجی بولے: "گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈ پہنچاتی ہے ڈک" اور کہا کہ یہ چائے والا نثر نگار اگر شاعر ہوتا تو اپنا تخلص ڈک رکھتا۔ میراجی کے اس قسم کے واقعات اگر جمع کیے جائیں تو اچھی خاصی ایک کتاب بن جائے اور بہت سی کتابیں جنھیں آپ

فلاں ابن فلاں کی تصانیف سمجھتے ہیں میراجی کے نام منتقل کرنی پڑیں، کیونکہ درحقیقت یہ میراجی کے کارنامے ہیں۔

جہاں راقم الحروف آج کل مقیم ہے یعنی یکے از مضافات لاہور میں، وہاں میراجی کے ایک ہومیوپیتھک قسم کے دوست ڈاکٹر فرزوق اور ان کے دوست حافظ عبدالرحمٰن لچھو فی سبیل اللہ قسم کی خدمت خلق پر مامور ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میراجی کے ہم جماعت رہ چکے ہیں اس لئے خاکسار کے ساتھ یہاں لاہور میں سب سے زیادہ اخلاق وہی برتتے ہیں ڈاکٹر صاحب کو جب معلوم ہو جائے کہ کسی مریض میں عشق یا ادب کی علامات پائی جارہی ہیں تو وہ فوراً اسے میری جانب منتقل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ میراجی کے بعد میں آگے ان کا سجادہ نشین ہوا ہوں اور ایک میں ہی اس قسم کے مریضوں کا مداوا کر سکتا ہوں۔ چنانچہ جب کوئی ایسا کیس مجھے ملتا ہے تو میں حتی الامکان اور حسب استطاعت ان افراد کی خدمت کرتا ہوں پہلے انھیں سمجھاتا ہوں کہ عشق اور ادب سے کن کن لوگوں کو اب تک کیسے کیسے نقصان پہنچے ۵

کر دیئے اس نے گھر کے گھر خالی

وغیرہ قسم کے مصرعے ان کے سامنے دہراتا ہوں انھیں سمجھاتا ہوں کہ اس میدان میں کیسا پھونک کر قدم رکھنا اور قلم اٹھانا پڑتا ہے لیکن عشق یا ادب کا مرض اگر جڑ پکڑ جائے تو پھر اس کا علاج حکیم لقمان کے پاس تھا اور نہ ڈاکٹر فرزوق کے پاس ہے چنانچہ جب میں چاہتا ہوں کہ قدم رکھنے یا قلم اٹھانے سے پہلے یہ مریض دوسرے شہیدانِ عشق وادب کے عبرتناک انجام سے سبق حاصل کریں تو وہ حذر بکنید کی ہدایت سے اس لئے استفادہ نہیں کر سکتے کہ من نہ کردم"!

حال ہی میں ڈاکٹر فرزوق نے ایک ایسا کیس بھیجا ہے کہ سوائے میراجی کے میرے خیال میں اور کسی کے بس کا نہیں۔ مریض نے اپنا حال ایک خود نوشت سوانح حیات کی شکل میں رقم کیا ہے۔ اس سرگزشت کو پڑھ کر بجائے مشورہ دینے کے صاحب سرگزشت کا رقیب بننے کو جی چاہتا ہے۔ "رشک آتا ہے کہ یہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے"۔ نام ان صاحب کا راؤ خلافت علی ہے اور ایک طرح سے پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ انھیں اطالوی ہیر سے محبت ہے اور اپنے قصے کے وارث شاہ بہ خود ہیں۔ گو وارث شاہ یا ورجیل کا سا حسن بیان انھیں ودیعت نہیں ہوا لیکن واقعہ اپنی جگہ اتنا ٹھوس ہے کہ کچھ لوگ علی صاحب کی یہ داستان پڑھ کر یا سن کر کہیں گے کہ کاش خدا ہوتا ــــــــ خدا ہوتا تا کہ دو دلوں کو یوں ہزاروں میل کے فصل سے نہ تڑپنے دیتا۔ بعض لوگ کہیں گے کہ خدا ہے اور دو دلوں کے تڑپنے ہی میں میاں کی کچھ مصلحت ہو گی۔ اس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ ایک فرقہ کہے گا کہ جب تک مذہب، رنگ و نسل، مختلف سیاسی عقائد، قدیم تہذیب و اخلاق اور جغرافیہ وغیرہ کے حدود حائل ہیں، دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہ دے گی۔ دوسرا فرقہ ان ساری حدود کو برحق اور انسانیت کے لئے مفید بتائے گا۔ غرضکہ جتنے منہ ہوں گے اتنی ہی باتیں سننے میں آئیں گی لیکن سوال یہ ہے کہ میں میراجی کی عدم موجودگی میں راؤ خلافت علی اور ان کی اطالوی محبوبہ کلارا کی کیا اور کیسے خدمت کروں؟ آج کو میراجی ہوتے تو چاہے انھیں کچھ ہی جتن کیوں نہ کرنے پڑتے۔ وہ کبھی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ علی اور کلارا محض اس وجہ سے آپس میں کبھی نہ مل سکیں کہ دونوں کے پاس نو برس کی انتہائی کوششوں کے باوجود ایک دوسرے کے پاس پہنچنے کا سفر خرچ جمع نہ ہو سکا۔ میراجی اس کار خیر کو زیادہ سے زیادہ نو مہینے میں کر دکھاتے اور پھر ایک مثنوی لکھتے کہ "تریاق عشق" ہوتی۔ ا

علی صاحب نے اپنی سرگزشت یوں شروع کی ہے جو زیادہ تر ان ہی کے الفاظ میں یوں ہے :-

"میں نومبر ۱۹۱۶ء میں کلانور ضلع رہتک میں پیدا ہوا ــــــ بدقسمتی سے باپ کا سر سے سایہ اُٹھ گیا تھا جب کہ ہم بچے ہی تھے۔ بڑے بھائی صاحب نے ہمیں پالا انھوں نے دس جماعت تک تعلیم دلائی۔ میں جب دسویں میں پڑھتا تھا تو جنگ عظیم چھڑ گئی۔ مجھے دنیا کی سیر کرنے کا پہلے ہی سے بہت شوق تھا۔ اس لئے میں نے بھائی صاحب سے فوج میں بھرتی ہونے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ نہ مانے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ میں کم از کم میٹرک تو ضرور کرلوں اور ان کا خیال تو آگے بھی پڑھانے کا تھا لیکن ہم بدقسمتی سے نہ مانے کیونکہ ہمارے دل میں دنیا کی سیر کی دھن سمائی ہوئی تھی۔ ایک روز موقع پاکر میں گھر سے بھاگ گیا اور ان کی رضامندی کے بغیر ہی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ انھوں نے پہلے تو بہت کوششیں کیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار میں برٹش انفنٹری ڈپو میں چلا گیا۔ ایک مہینے بعد بھائی مجھ سے ملنے آئے لیکن اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا وہ مایوس گھر لوٹ آئے انھوں نے کہا اب تم بھرتی ہو ہی گئے ہو لیکن کام ایسا کرنا جس سے تمہارا مستقبل بن جائے۔ وہ مجھے تسلی دے کر واپس چلے گئے"

یہ گویا آغاز ہے ایک نئی ہیر رانجھے کی کہانی کا۔ ایک ایسی داستان عشق کا۔ جس کا ہیرو، ہیروئن اور مصنف تینوں تا دم تحریر بقید حیات ہیں۔ آگے چل کر علی صاحب لکھتے ہیں :-

"۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو ہماری رجمنٹ بمبئی پورٹ پر پہنچی اور ۲۲ دسمبر کو ہمارا جہاز

روانہ ہو گیا۔ راستے میں سمندر کے چڑھاؤ کی وجہ سے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی
کیونکہ سمندر کا پہلا سفر تھا اس لئے چکر بہت آتے تھے، آٹھ دن کے سفر کے بعد
ہم بصرہ کی بندرگاہ پر پہنچے وہاں چند دن قیام کرنے کے بعد ہمیں بغداد
شریف جانا پڑا بغداد شریف کے اسٹیشن کے قریب ہمارا کیمپ بنایا گیا
جب ہمیں کیمپ کرنے کا حکم ملا تو میرا خیمہ بالکل تاروں کے پاس آخری لائن
پر تھا وہاں سے اسٹیشن ماسٹر کے گھر کے لئے صرف ایک سڑک بیچ میں تھی جو
دس گز چوڑی تھی۔ میری کمپنی میں صرف میں ہی انگریزی بولنی جانتا تھا اس لئے
اسٹیشن ماسٹر کے لڑکے سے میری ملاقات ہو گئی۔ اس کی عمر بارہ سال کی تھی وہ
لوگ کرسچن تھے۔ اس کی دو بڑی بہنیں اور تھیں۔ ان دونوں سے بھی ملاقات
ہوئی۔ یہ ملاقات آہستہ آہستہ محبت بن گئی۔ انھوں نے میری بہت خدمت
کی یہاں تک کہ جب میں پریڈ سے واپس آتا تو وہ ہر روز لیمن کی بوتل اور
فروٹ بھیجا کرتی تھیں اور جب تک میں کھانا نہ کھا لیتا تھا وہ بھی نہ کھاتی تھیں
وہ دونوں مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھیں۔ ہمارا قیام چونکہ زیادہ دن
کہیں نہ ہوتا تھا اس لئے ایک مہینے کی مدت کے بعد یہ دل خراش بات سنی
کہ ہمیں شام کو یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ میں نے جب ان کو یہ خبر سنائی تو
انھوں نے بہت افسوس ظاہر کیا اور اس جدائی کی وجہ سے انھوں نے
بہت آنسو بہائے۔ چلتے وقت انھوں نے ایک رومال بطور نشانی دیا
جو بدقسمتی سے سمندر میں ڈوب گیا۔"

اس کے بعد سمندر کے سفر کی صعوبتوں کی وہ تفصیلات ہیں۔ جو عام طور پر

دورانِ جنگ میں فوجیوں کو پیش آسکتی ہیں اور دشمن کی قید و بند میں رہنے کا بھی ذکر ہے۔ اب یہ سنیئے کہ اسٹیشن ماسٹر کی لڑکیوں کا تحفۂ محبت یعنی وہ رومال سمندر میں کیسے ڈوبا۔ علی صاحب لکھتے ہیں :-

"جب میں نے جہاز کا پچھلا حصہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ جہاز سخت زخمی ہوا ہے اور آہستہ آہستہ بیٹھتا جا رہا ہے۔ میں نے فوراً لوگوں کو آواز دی کہ جہاز ڈوب رہا ہے۔ اپنی جان بچانے کی کوشش کرو۔ سیڑھی ٹوٹنے کی وجہ سے بہت سے قیدی ہم میں سے اوپر نہ آسکے۔ میں نے فوراً پانی میں چھلانگ لگائی اور جلدی جلدی تیرنے لگا۔ کیونکہ جہاز کے ڈوبتے وقت جہاز کے قریب کا پانی بہت زور سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ میں بہ مشکل سو گز ہی نکلا ہوں گا کہ جہاز پانی میں بیٹھ گیا اور لوگ اِدھر اُدھر تیرتے نظر آئے۔ پٹرول کے بڑے بڑے ڈرم کافی تھے۔ بہت سے قیدیوں نے اِن پر سوار ہونا چاہا، لیکن بد قسمتی سے جس نے بھی ان کا سہارا لیا ڈوب گیا کیونکہ وہ ہاتھ لگاتے ہی پھر جاتے تھے گول ہونے کی وجہ سے۔ کنارہ بارہ میل تھا اور بندرگاہ اٹھارہ میل۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا اور پانی کی لہریں بہت بڑی بڑی اُٹھ رہی تھیں۔ تین چار میل تیرنے کے بعد پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے اور سانس ٹوٹنے لگا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ایک ساتھی ایک مختصر تختہ لئے ہوئے تیر رہا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی اور کہا کہ اب مجھ سے نہیں تیرا جاتا اور اگر تو زندہ واپس پہنچ جائے تو میرا سلام کہہ دینا جب اس نے یہ الفاظ سنے تو کہا ہمت نہ ہارو مجھ تک پہنچ جاؤ۔ ہم دونوں

اس تختہ کا سہارا لے لیں گے۔ میں جو قمیص پہنے ہوئے تھا وہ لکڑی کے کپڑے کی بنی ہوئی تھی اور پانی سے بہت اکڑ گئی تھی۔ اس لئے تیرنے میں بہت رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے اتار کر پھینک دیا۔ جب وہ ڈوبنے لگی تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اس میں اُن دونوں بہنوں کا ایک رومال بطور نشانی دیا ہوا تھا جو مجھے بغداد میں ملی تھیں۔ میں فوراً واپس قمیص لینے کے لیے لپکا لیکن وہ ڈوب چکی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہوا اور ان دونوں کی شکلیں سامنے پھرتی نظر آنے لگیں۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ یہ ایک ہماری ادنیٰ سی نشانی تم نے کھو دی۔ بہت بُرا کیا۔ اس طرح ہم بھی تم سے نہ مل سکیں گے۔ اور واقعی وہ پھر کبھی نہ مل سکیں۔"

مندرجہ بالا حصہ سرگزشت پڑھ کر آپ کو علی صاحب کی افتادِ طبع اور مزاج کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اس سفر کا حال اگر پورا آپ سنیں تو سندباد جہازی کا ذکر آپ کو غیر دلچسپ معلوم ہو ——— لیکن یہاں چونکہ علی اور کلارا کا ذکر کرنا مقصود ہے اس لئے یہ سنیئے کہ علی صاحب کلارا تک کیسے پہنچے۔ جو اس کہانی کی اصل ہیروئن ہے۔ علی صاحب کا بیان ہے کہ :۔

"سردی اور بھوک سے نڈھال جب ہم کنارے پر پہنچے تو بہت سے اٹالین شہری موجود تھے۔ کوئی سگرٹ پیش کرتا، کوئی سگار، کوئی روٹی، کوئی کچھ، کوئی کچھ۔ غرضکہ اطالوی شہری بہت ہی اچھی طرح پیش آئے۔ کنارے پر اترنے کے بعد ہمیں بس میں بٹھا کر چوبی بارکوں میں لے گئے وہاں اتفاق سے ایک اٹالین میجر بہت ہی نیک دل ملا۔ اس نے فوراً چائے، کپڑے اور خوراک کا

بند وبست کر دیا ——— ہم چار سو قیدیوں میں سے دو سو پچیس مر گئے تھے۔ اور ایک سو پچیس ڈوب گئے۔ اٹالین محافظوں سے چالیس میں سے صرف بارہ زندہ بچے، باقی سب سمندر کی بھینٹ چڑھ گئے۔ دوسرے روز صبح ہوتے ہی ہم کیمپ کو روانہ ہو گئے۔ چند گھنٹوں میں کیمپ میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک فاشسٹ میجر کیمپ انچارج تھا جو بہت ہی ذلیل تھا اور ظالم تھا۔ وہ تمام دن ہم سے پتھر اٹھواتا اور اتنی خوراک دیتا کہ آدمی بس زندہ رہ سکے۔ وہاں کے لوگ ہمارے ہندوستان میں قید تھے۔ ان کی بوڑھی مائیں شام کو ہمارے لئے پھل، روٹی وغیرہ کھانے کے لئے لاتی تھیں وہ بہت روتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ہمارے بچوں کو بھی وہاں اسی طرح تکلیف ہو گی۔ ہم انھیں بہت تسلی دیتے کہ نہیں وہ لوگ بڑے آرام سے ہیں وہ اتنے ظالم نہیں جتنے یہ تمہارے ہیں۔ وہ عورتیں جو چیز بھی کھانے کو لاتیں سنتری ان سے لے کر خود کھا جاتے اور ہم تک ذرہ بھر بھی نہیں پہنچتا ——— وہاں سے ہم اٹلی کے بڑے قیدی کیمپ ویزانو میں پہنچے ——— ہم نے دیکھا کہ تمام چیزیں سفید ہی سفید نظر آ رہی ہیں باہر نکلنے سے معلوم ہوا کہ برف ہے۔ یہ ہمارا پہلا روز تھا کہ اپنی زندگی میں برف پڑتے دیکھی ——— وہاں پر تقریباً چار ہزار قیدی رہا کرتے تھے اور چھبیس بارکیں تھیں ——— ہماری ایک پارٹی جس کی تعداد صرف پچاس قیدیوں پر مشتمل تھی وہاں سے چند دنوں کے لئے ایک ورکنگ کیمپ میں گئے جس میں ہم مسلم راجپوت ہی شامل تھے اور ہمارے ساتھ ایک انٹرپریٹر جو کہ گوا کا رہنے والا تھا ساتھ گیا۔ جب

پہلے پہل اس کیمپ میں پہنچے تو وہاں کے لوگوں کے لیے ہم اچھے خاصے دلچسپی کا سامان بن گئے۔ صبح شام یعنی ہر وقت ان کا تانتا لگا رہتا کیونکہ ہمارے خلاف اتنا زبردست پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ انڈین بالکل جنگلی، جاہل اور حیوانوں کی طرح رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو جنگل سے پکڑ کر لایا جاتا ہے۔ ان کو رہنا سہنا، کھانا پینا سکھایا جاتا ہے ـــــ اس لئے جو بھی سنتا انڈین آئے ہیں دیکھنے کے شوق میں چلا آتا اور اس گاؤں کے لوگ تو خاص طور پر ہر وقت کیمپ کے نزدیک کھڑے رہتے اور ہمارے انسان ہونے پر تعجب کا اظہار کرتے۔ وہ لوگ طرح طرح کے سوال کرتے ہمیں ہنسی بھی بہت آتی اور ان کی تسلی بھی کرتے۔ اٹلی کے لوگ بہت خوبصورت، مہذب، رحم دل اور باادب ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ جو لوگ مسولینی کی پارٹی کے تھے۔ حد سے بڑھ کر ظلم کرتے۔ ہم تو ٹھیرے قیدی۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں کو بھی نہ بخشتے تھے۔ جو ان کے خلاف کچھ کام کرتا   یہ لوگ جب بھی بازار سے نکلتے، ان کی کالی قمیصیں ہوا کرتیں اور ان کی زبان پر یہ گانا ہوا کرتا (گانا پہلے اطالوی زبان میں لکھا ہے اور پھر شاید علی صاحب نے اس کا لفظی ترجمہ کیا ہے) گانا یہ ہے :-

BOTTE BOTTE SOMP.À BOTTE CASAZZO PUGRA

SE NO CANO SAIETA GESR DETE NAS FUFA CA

NOC SLA MO FASEISÈTE - EETA HANNO CNUI CTANERA

مارو۔ ہر وقت مارو ان لوگوں کو ایسا مارو کہ اپنے منہ کو ملتے رہ جائیں۔ اگر ہم کو نہیں پہچانتے ہو تو ہمارے چہروں کی طرف دیکھو۔ ہم فاسسٹ پارٹی کے ہیں۔

ہمارے جسموں پر کالی قمیصیں ہیں یہ ہماری لشانی ہے۔"
فاسسٹوں کی قید و بند کی بے انتہا سختیوں کے ذکر کے بعد کلا را کا "واقعہ"
یوں شروع ہوتا ہے، یعنی اصل قصہ :-

ایک روز شام کو میں معہ اپنے ایک ساتھی نیاز محمد کے تاروں کی لائن کے پاس کھڑا ہوا، آنے جانے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے چاروں طرف چونکہ تار اور سپاہی پہرہ دار ہوتے تھے اس لئے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ چنانچہ اپنے کمرے سے باہر نکل کر تاروں کی لائن کے پاس آجاتے تھے۔ جب ہم دونوں وہاں کھڑے تھے تو تین لڑکیاں وہاں سے گذریں۔ ان میں سے ایک مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اگر یہ لڑکی شریکِ حیات بن جائے تو کتنا اچھا ہے۔ نیاز محمد کہنے لگا تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے ہم قیدی یہ آزاد۔ دوسرا ملک، دوسرا مذہب یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا ممکن ناممکن کا سوال نہیں، مجھے یہ بہت پسند ہے اور کوشش کروں گا۔ یہ لڑکیاں ہر روز شام کے وقت آیا کرتی تھیں۔ ان کی عمر ۱۸، ۱۷ اور ۱۶ سال کی تھی۔ اس لڑکی کا نام جسے میں چاہتا تھا اس کی عمر ۱۶ سال نام کلارا تھا۔ ایک روز میں نل سے پانی پی رہا تھا کہ یہ تینوں حسبِ معمول آئیں۔ نل سڑک کے بالکل قریب تھا میری نظر اچانک اس پر پڑی اور ایک دم زبان سے سلام نکل گیا۔ میں نے اٹالین پڑھنی شروع کر رکھی تھی اس لئے ان کی زبان میں سلام کیا۔ اس نے بڑی اچھی طرح سلام کا جواب دیا۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی جو سلام سے شروع ہوئی۔ میں ہر روز شام کو اس کا انتظار کیا کرتا لیکن اس نے اس روز سے

آنا بالکل بند کر دیا نہ معلوم کیوں ؛ چند دن کے بعد وہ بعد اپنے بھائی اور
باپ کے کیمپ میں آئی۔ اس کا بھائی کچھ انجینیر کا کام جانتا تھا اس لیئے اس کا
باپ ہمارے کیمپ میں اسے کام پر لگانے کے لیئے لایا تھا ـــــ کلارا کے
بھائی کو اس کیمپ میں کام مل گیا ـــــ کلارا کے بھائی کا نام پابیالو ہے۔
ہم لوگوں کو حکم نہ تھا کہ کسی اٹالین شہری سے بات چیت کریں، اس لیئے ان سے
ملاقات کرنی سخت مشکل تھی ''۔

اس کے بعد علی صاحب نے پھر اپنی قید و بند کی تکالیف کا ذکر بالتفصیل کیا ہے
کلارا کا قصہ پھر یوں شروع ہوتا ہے :۔

"وہ ہر روز صبح شام آتی اور دور ہی سے سلام کرتی ہوئی نکل جاتی۔ اس طرح
ہماری محبت بڑھتی چلی گئی ـــــ انٹرپریٹر صاحب ہمارے رقیب بن گئے
لڑکی چونکہ خوبصورت تھی اس لیئے ان کی نیت بھی خراب ہو گئی۔ اس نے میرے
چچیرے بھائی سے جو کہ میرے ساتھ (فاسسٹوں کی قید میں) تھے میری شکایت
کر دی، بھائی صاحب نے ہمیں بہت ڈانٹا۔ میں نے ان کے آگے بالکل لاعلمی
ظاہر کی۔ اس طرح بہ مشکل پیچھا چھڑایا ـــــ ہم دونوں آپس میں ملنے کے لیئے
بہت بے قرار تھے۔ ہم دونوں چاہتے کہ ہم ایک دوسرے کو بہت نزدیک
ہو کر دیکھیں لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ سنتری ہر وقت پہرے پر رہتے
تھے لیکن پھر بھی ہمارے درمیان محبت بڑھتی گئی اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی
کہ بغیر ایک دوسرے کو دیکھے قرار نہ آتا ـــــ مسولینی کی گرفتاری کے بعد ہمیں
نازیوں کے کیمپ میں جانا پڑا ـــــ ٹرین آئی۔ یہ ہمارا ڈبہ گاڑی کے پیچھے

لگا دیا گیا۔ کلارا بعہ اپنی بڑی بہن کے پلیٹ فارم پر آگئی اور ہمارے ڈبے کے
بالکل قریب ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میں ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہوا اس کی طرف
دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل بت بنی ہوئی کھڑی تھی جب گاڑی وسل دے کر چلی تو
اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گر رہے لیکن جسم میں حرکت نہ ہوئی۔ جب
گاڑی پلیٹ فارم سے گذری تو اُن لے اپنا رومال نکال کر الوداعی سلام کیا
ہم ایک گھنٹے کے بعد اپنے پہلے کیمپ میں پہنچ گئے۔ دوسرے ہی روز فاسسٹوں
کی بجائے نازی سنتری آگئے اور فاسسٹوں کو بھگا دیا۔ دس بجے کے قریب
ایک میرے ساتھی نے مجھے آکر بتایا کہ کلارا معہ اپنی سہیلیوں کے آئی ہے۔
جب میں تاروں کی لائن کے قریب پہنچا تو وہ واپس جا چکی تھی۔ وہ جرمن سپاہیوں
کو دیکھ کر ڈر گئی اور بغیر ملے ہی واپس چلی گئی ــــــــ"

پھر نازیوں کے بہیمانہ سلوک اور مظالم کی طویل داستان کے بعد علی صاحب
نے نازیوں کی قید سے فرار ہونے کا ذکر اپنے انداز میں کیا ہے اور اس کے بعد
مختلف دیہات اور اطالوی باشندوں کے حسنِ سلوک اور انسان دوستی کا حال لکھا
ہے۔ علی صاحب اور اُن کے ساتھی اٹلی کے مختلف دیہات میں چھپتے پھرتے ہیں۔
اور جہاں جاتے ہیں وہاں ان کی ایسی آؤ بھگت اور خاطر مدارات ہوتی ہے کہ
پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔ علی صاحب کی داستان کے یہ اوراق پڑھ کر اندازہ ہوتا
ہے کہ اٹلی کے باشندے کس قدر با اخلاق، انسان دوست اور غریب نواز ہوتے
ہیں۔ انھیں اوراق میں ایک اور ہلکے سے رومان کا "نخلستان" بھی ہے۔ یہ آپ بھی
ملاحظہ کیجیے:-

"دورانو صبح و شام ہمارے لئے کھانا لاتا رہا۔۔۔۔ سربون کی بہن جس کا نام دورا تھا اپنی خالہ زاد بہن فلو تسرا کے ساتھ شام کو آتی رہتی ۔۔۔۔ دورا نے مجھ سے کچھ دلچسپی لینی شروع کی کیونکہ میں اپنے ساتھیوں میں بالکل نوجوان تھا۔۔۔۔ اور وہاں لڑکیاں اچھے جوانوں کو پسند کرتی ہیں خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہوں اس لئے دورا صاحبہ ہمارے ساتھ عشق فرمانے لگیں مجھے پہلے تو خبر نہ ہوئی میں یہی سمجھتا رہا کہ یونہی دل لگی کرتی ہے لیکن ایک روز جب کہ میں اکیلا بیٹھا ہوا ایک ناول پڑھ رہا تھا جسے میں کیمپ سے بھاگتے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا پڑھ رہا تھا کہ دورا میرے پاس آ بیٹھی اور لگی باتیں کرنے۔ میں نے اس عرصے میں خاصی اطالین بولنی شروع کر دی تھی۔ باتوں کے دوران میں اس نے مجھ پر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں یہ جان کر بہت پریشان ہوا کیونکہ پہلے کلارا سے محبت کر چکا تھا اس لئے مجھے اور کوئی لڑکی پسند نہ تھی۔ اس کے باوجود میں نے دورا پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ مجھے اس سے محبت نہیں کیونکہ ہم بلاشبہ ان کے رحم و کرم پر تھے اور انھیں ناراض کرنا نہ چاہتے تھے۔"

اس کے بعد علی صاحب کی ساری داستان میں کہیں اس لڑکی دورا یا اس محبت کا ذکر نہیں ملتا ۔۔۔۔ میری دانست میں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ علی صاحب پر دشمنوں سے روپوش رہنے کے سلسلے میں کچھ ایسی مشکلیں پڑیں کہ یاراں فراموش کردند عشق۔ لیکن ان سب آفتوں کے سامنے کے باوجود علی صاحب کا کوئی لمحہ کلارا کی یاد سے خالی نہیں گزرا۔ علی اور ان کے ساتھی فاسسٹوں اور نازیوں سے چھپتے چھپاتے گاؤں گاؤں پھر رہے تھے۔ ان مفرور قیدیوں میں ان کے چچا زاد بھائی صاحب بھی

شامل تھے۔ مختصر یہ کہ ایک دن آخر کار کلارا کے بھائی پاپیا تو نے ان مفرور قیدیوں کو ڈھونڈھ نکالا۔ علی صاحب لکھتے ہیں :-

"میں جوں ہی اس کے قریب پہنچا مجھے دیکھتے ہی بغیر کچھ کہے مجھ سے لپٹ گیا اور لگا بوسے لینے۔ اُس کی اس محبت نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ چند منٹ کے بعد وہ میرے گلے سے لپٹ کر کہنے لگا کہ تم نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور میرے پاس نہ آئے۔ جب سے میں نے اور کلارا نے یہ خبر سنی کہ علی کیمپ سے بھاگ گیا ہے۔ وہ مجھے ہر روز ناشتہ کرا کر گھر سے نکال دیتی ہے کہ جاؤ میرے علی کو تلاش کر کے لاؤ۔ آج دو مہینے ہونے کو آئے۔ میں حسب دستور ہر روز اسی طرح صبح کو آتا اور پہاڑوں کا چکر کاٹ کر واپس چلا جاتا۔ جب کلارا مجھے اکیلا آتے دیکھتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ میں یہ منظر برداشت نہ کر سکتا اور اُس کے ساتھ اُس کے غم میں شریک ہو کر رونے لگتا۔ میرے دو جوڑی جوتے ٹوٹ گئے لیکن تم نہ مل سکے۔ آج خدا کا شکر ہے کہ میں کامیاب ہو گیا اور تمہیں پا لیا۔ علی! اگر تمہیں میری وفاداری پر یقین نہیں تو کم از کم میری بہن پر رحم کرو۔ وہ تمہیں ایک نظر دیکھنے کو تڑپ رہی ہے۔"

یہاں علی صاحب نے اُس "مشاورتی بورڈ" کا ذکر کیا ہے جس کے "چیرمین" اُن کے بھائی صاحب تھے اور جنھوں نے "ناصحانِ مشفق" کی پوری پوری روایات کو برقرار رکھا اور علی صاحب کے جذبات کا مطلق کوئی احترام نہیں کیا۔ بورڈ کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ کلارا اور علی کا ملنا چونکہ مفرور قیدیوں اور کلارا کے خاندان اور گاؤں کے افراد کے لیے بے انتہا مضرت رساں ثابت ہو سکتا ہے اس لئے ان دونوں کو

حتی الامکان ملنے سے روکا جائے۔ ایک طرف تو اس "جلسے" کی کارروائی کا تذکرہ ہے اور دوسری طرف پاپیا نو یعنی کلارا کے بھائی کی زبانی کلارا کی بے تابی، ہجر کی تڑپ اور فوراً پھر ملنے کی آرزو کا بیان ہے اور پھر آخر کار پاپیانو کے بے نیل و مرام واپس اپنے گاؤں لوٹ جانے کا ذکر۔ اس کے بعد علی صاحب اور ان کے ساتھی جن پہاڑی دیہات میں چھپتے پھر رہے تھے' ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے کی تفصیل ہے۔ انھیں آلام و مصائب میں دوراکی محبت کی طرح ایک وقتی سارومان اور ہے جسے علی صاحب ہی کے الفاظ میں سنیئے :۔

"گاؤں کے اس گھر میں جو پہاڑ کے دامن میں تھا ایک لڑکی جس کا نام مارکتا تھا۔ اس سے میری جان پہچان ہو گئی۔ وہ گانا بہت اچھا گاتی تھی۔ اس لئے جب کبھی مجھے ماسٹرنی ماریا اداس دیکھتی تو اسے بلا لاتی اور وہ میرا دل بہلاتی اس لڑکی کو مجھ سے بہت انسیت ہو گئی اور مجھے بھی قدرے محبت ہو گئی وہ میرے پاس گھنٹوں اکیلی بیٹھی رہتی اور طرح طرح کی باتوں سے میرا دل بہلایا کرتی ماسٹرنی صاحبہ مجھ سے بالکل اپنے لڑکے کی طرح پیار کرتی تھیں۔ ماسٹرنی نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ آزاد ہونے کے بعد تم میرے پاس رہنا۔ میرے چونکہ کوئی لڑکا نہیں ہے۔ اس لئے تم ہی میری زمین کے اکیلے مالک بن جانا۔ میں نے بھی 'ہاں' کہہ دی اور اُس کی تسلی کر دی۔"

مارکتا کا قصہ اتنا ہی ہے۔ پھر علی صاحب نے لکھا کہ کس طرح وہ کلارا کی یاد میں اور زیادہ محو رہنے لگے۔ حالانکہ نازی اور فاسسٹ جاسوسوں کے گروہ ہر وقت ان کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور یہ گاؤں گاؤں اور گھر گھر چھپتے پھر رہے تھے

جگہ جگہ اطالویوں کی مہمان نوازی کا بالتفصیل ذکر ہے جس میں ماسٹرنی صاحبہ کی شفقت کا بیان خاص خلوص سے علی صاحب نے کیا ہے۔ علی صاحب نے ایک دن ماسٹرنی کے شوہر کے ہاتھ کلارا کو ایک خط بھجوایا جس کا ترجمہ خود علی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے۔

"پیاری کلارا ــــ میں خیریت سے ہوں اور ابھی تک زندہ ہوں۔ میرا دل تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے قریب رہوں لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہیں تکلیف پہنچے۔ میں کیمپ سے صرف تمہارا ہی سہارا لے کر نکلا تھا۔ اگر تم میری نہ ہوتیں تو نہ جانے آج کس جگہ نازیوں کے ظلم و ستم میں پھنسا ہوا ہوتا۔ تیری محبت نے مجھے کیمپ سے بھاگنے پر مجبور کیا۔ رات کو راستہ بھول گیا اور اس گاؤں کی طرف آنکلا جہاں اب موجود ہوں۔ میرے ساتھ میرے بڑے بھائی جن کو تم اچھی طرح جانتی ہو اور چار اور دوسرے ساتھی ہیں ہم اس گاؤں کے لوگوں کی مہربانیوں سے اچھے دن گذار رہے ہیں۔ کیا لکھوں مجھے تم سے اتنی دور رہ کر کتنی تکلیف ہوتی ہے لیکن مجبوری کی وجہ سے نہیں آسکتا۔ دعا کرنا کہ جلد اس مصیبت سے آزاد ہو جائیں۔ آزاد ہونے پر فوراً تمہاری خدمت میں حاضر ہوں گا۔ اچھا خدا حافظ!

تمہارا ــــ علی"۔

خط روانہ کرنے کے بعد علی صاحب اور ان کے مفرور ساتھیوں کو کن کن ہنگاموں سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔ بہر حال خط ملنے پر کلارا نے اپنی ساری پونجی جو ایک ہزار لیرہ پر مشتمل تھی کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور علی کے خط کا جواب کسی نہ کسی طرح علی تک پہنچایا۔ خط کا جواب راؤ خلافت علی کے الفاظ میں یہ ہے:۔

پیارے علی ــــ تمہاری خیریت کی خبر پاکر بہت خوش ہوئی ہوں۔ میں ہر وقت

یہی دعا کرتی ہوں کہ خدا تمہیں جلد از جلد آزاد کرے۔ دل چاہتا ہے کہ تم سے آکر ملوں لیکن نہ معلوم تم کہاں ہو اور کیوں مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ میرے پیارے علی اپنی کلارا کو مت بھول جانا۔ ہماری زبان سیکھتے ہیں اور زیادہ کوشش کرنا تاکہ جب ہم ملیں تو اچھی طرح اپنے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ اگر کوئی خدمت میرے لائق سمجھو تو لکھنا۔ میں اور میرا بھائی ہر وقت حاضر ہیں۔ میرا محبت بھرا سلام قبول ہو۔ پاپیانو سلام کہتا ہے۔ خدا تمہیں جلد آزاد کرے۔ فقط

تمہاری ــــــ کلارا ہر وقت کے لئے"

اس خط کے بعد علی صاحب نے پھر اپنی پریشانیوں اور جنگ کے شعلوں میں اٹلی کے بھسم ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ اٹلی جو ایک طرح دوران جنگ میں "ڈانٹے کا جہنم" بن کر رہ گیا تھا۔ اگر یہاں کہیں ڈانٹے کا قلم ہوتا تو شاید ایک اور "انیفیرنو" کا ادب میں اضافہ ہو جاتا علی صاحب کے الفاظ میں اٹلی کی جنگ کے ایک سین کی جھلک ملاحظہ ہو:-

"امریکن پائلٹ بہت سختی سے نازیوں پر حملہ کرتے اگر کوئی نازی موٹر سے کود کر جھاڑی میں چھپ جاتا تو امریکن ہوا باز اتنے نیچے آ جایا کرتے کہ کھڑی فصلیں بھی لٹ جایا کرتیں۔ امریکن پائیلٹ جب تک نازی تلاش نہ کر لیتا واپس نہ جاتا"

غرضیکہ نازیوں اور امریکنوں کی لڑائی کا حال بہت طول طویل ہے آخر کار لکھا ہے کہ:-

۹ رجون ۱۹۴۲ء کو پورے دو سال کے بعد ہم آزاد تھے۔ اس رات کو ہمارے جاننے والوں نے بہت خوشیاں منائیں لیکن ہمیں روما نو کی جدائی کا بہت

انسوس تھا (روماٹو علی صاحب کا وہ اطالوی دوست ہے جس نے روپوشی کے زمانے میں علی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی اپنی جان پر کھیل کر بے غرض مدد کی)۔

آزاد ہوتے ہی علی صاحب نے کلارا کے مکان کی تلاش شروع کی اور جوئندہ یابندہ کے مصداق ایک دن یہ بارگاہ ناز میں جا ہی پہنچے۔ لکھا ہے:۔

گھر کے اندر داخل ہوا تو کلارا بمعہ اپنی ماں کے گھر میں موجود تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔ اُس کی ماں نے جواب دیا۔ وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی میں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ جو اس طرح خاموش ہو، اس نے جواب دیا کہ جب تم کو مجھ سے محبت ہی نہیں تو کس طرح ہم کلام ہوں۔ میں نے کہا یہ کس طرح معلوم ہوا تمہیں۔ اگر تم سے محبت نہ ہوتی تو یہاں کیسے آتا۔ اس نے کہا کہ سارنو تو کافی دیر ہوئی آگیا تھا اور تم اتنی دیر بعد۔ میں نے کہا اُس کو سائیکل پہلے مل گئی تھی اور مجھے تلاش میں دیر ہو گئی۔ اب بتاؤ کہ اس میں میرا کیا قصور ہے یہ سن کر اُس نے کہا کہ مجھے معاف کرنا۔ میں نے غلط سمجھا۔ ہم شام تک باتیں کرتے رہے۔ اس کا بھائی، بہن، ماں باپ اور چند ایک اور آدمی۔ جو مجھے جانتے تھے خوب اچھی طرح ملے۔ شام ہوتے ہی میں واپس آیا۔ کلارا نے بہت روکا لیکن میں نے رات کو وہاں ٹھیرنا اچھا نہیں سمجھا۔ اور واپس آگیا۔

علی صاحب چند دن تک کلارا سے اس طرح ملتے رہتے ہیں ان کے الفاظ میں ایک روز کا ذکر ہے کہ

"کلارا کے گھر پہنچ کر مجھے سخت بخار چڑھ گیا۔ پاپیانیو دیا پاپنیو سخت پریشان دوا وغیرہ لانے کے لئے پھر رہا تھا۔ کلارا پریشان حال میرے پاس کرسی پر

بیٹھی ہوئی تھی۔ کلارا نے مجھے اپنے کمرے میں اور اپنے بستر پر لیٹنے دیا تھا۔ مجھے
جب ہوش آیا تو دیکھا کہ کلارا زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ پگلی تم روتی
کیوں ہو بخار ہے کوئی اور تکلیف نہیں۔ اُتر جائے گا۔ وہ میرے بولنے سے
اور بھی زیادہ رونے لگی اپنا چہرہ میرے سینے پر رکھ دیا اور خوب آنسو بہائے
یہاں تک میری قمیص بھی تر ہو گئی۔ میں جوں جوں منع کرتا۔ وہ اتنی ہی روتی بہ مشکل
تمام خاموش ہوئی۔ میں نے کہا پاگل اتنی کیوں روتی ہے۔ اگر زندگی رہی تو پھر
ملیں گے۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے اپنا سر پھر میرے سینے
پر رکھ دیا اور ایک اضطراب کے عالم میں مجھے رو رو کر پیار کرنے لگی۔ وہ اپنے
خیال میں مست تھی اُسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کا
بھائی وغیرہ نہ نکل آئے۔ میں بھی اُس کے پیار کا جواب پیار سے دے رہا تھا
آخر کار میں نے اُسے مجبور کیا کہ وہ الگ ہو بیٹھے۔ کرسی پر وہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے
بولی کہ اگر تم نہ آ سکے تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی اب تھوڑی دیر میں تم جدا
ہو جاؤ گے۔ پھر نہ معلوم کب ملاقات ہو گی۔ کاش اس وقت سے پہلے موت
آ جاتی۔ پھر وہ ایک دم اُٹھی اور اپنے جتنے بھی فوٹو تھے نکال لائی۔ اُن پر اس نے
طرح طرح کے جملے لکھے اور مجھے دیئے اور کہنے لگی کہ یہ میرے فوٹو میری یاد تمہیں
دلاتے رہیں گے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا اور یہ کبھی نہ بھولنا کہ تمہاری جدائی میں
تمہاری بدنصیب کلارا ہمیشہ بے چین رہے گی۔ علی میں تمہاری ہو چکی اور ساری
عمر تمہاری رہوں گی۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی مجھے کوئی طاقت تم سے جدا
نہیں کر سکتی۔ ہماری جانیں دو ہیں لیکن روح ایک ہے۔ ہمارے درمیان یہ

عہد وپیمان ہو ہی رہے تھے کہ پاپیا نیو آیا اور کہا کہ تمہارے لئے ایمبولنس آگئی ہے۔ کلارا یہ سنتے ہی سکتے کے سے عالم میں آگئی۔ پاپیا نیو جاکر سپاہیوں کو اندر لے آیا۔ سپاہی بمعہ اسٹریچر کے میرے کمرے میں جہاں میں لیٹا تھا آگئے۔ مجھے اس وقت ایک سو پانچ بخار تھا۔ اُٹھنے کی بالکل طاقت نہ تھی۔ انھوں نے مجھے اسٹریچر پر لٹایا اور کار میں لے جاکر لٹا دیا۔ کلارا اور اُس کی بڑی بہن کار کے دروازے کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔ کئی ایک جاننے والے مجھے الوداع کہنے کو آئے ہوئے تھے۔ جب گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو کلارا نے بڑھ کر مجھے پیار کیا اور دعا کی کہ خدا تمہیں جلد اچھا کرکے واپس لائے۔ جب گاڑی نے حرکت کی تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور اپنی بہن کی گود میں گر پڑی۔ میں نے حسرت بھری نگاہ ڈالی اور آنکھیں بند ہوگئیں۔"

یہاں پھر علی صاحب نے وہ واقعات قلم بند کئے ہیں کہ جب آنکھ کھلی تو کیا گذری۔ ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کو ان کی داستان سن کر ان کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگئی اور یہ "فرزدق" صفت ڈاکٹر علی صاحب کو اپنی جیپ میں بٹھا کر آخری ملاقات کرانے کے لئے علی کو کلارا کے مکان پر لے پہنچا۔ رخصت ہوتے وقت کلارا اور اس کے بھائی نے کہا کہ ہم دونوں "جیپ" کے ساتھ ساتھ سائیکلوں پر چلیں گے۔ یہاں تک کہ ہم خود تھک کر آگے نہ جاسکیں، ڈاکٹر اور علی نے ان دونوں بہن بھائیوں کو ہزار سمجھایا لیکن ان دونوں نے ایک نہ سُنی اور سات میل تک کلارا اور اُس کے بھائی نے موٹر کا ساتھ سائیکلوں پر دیا۔ یہاں تک کہ ان کا سانس جواب دے گیا۔

علی صاحب لکھتے ہیں :۔

"ڈاکٹر نے کہا ان سے کہ دو رات ہونے والی ہے اب واپس چلے جائیں لیکن کلارا واپس نہ جانے پر بضد تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُس کو تسلی دے کر واپسی پر رضا مند کر لیا۔ جب کار اسٹارٹ ہوئی تو کلارا بے ہوش ہو کر گر پڑی میں بہت گھبرا گیا۔ ڈاکٹر نے خود نیچے اتر کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کی تقریباً بیس منٹ بعد وہ ہوش میں آئی۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا۔ وہ سوائے آنسو گرانے کے اور کوئی جواب نہ دے سکی۔ خیر میں بہ مشکل تمام اپنے آپ کو سنبھال کر کار میں سوار ہوا اور کار چل پڑی۔ چلتے ہوئے میں نے سلام کیا۔ کلارا کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بھائی نے جواب دیا۔ کلارا بدستور میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اب مجھ سے بھی برداشت نہ ہو سکا۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے۔ میں کلارا کی یہ حالت نہ دیکھ سکا۔ میں نے اپنا منہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اسی حالت میں مجھ پر غشی طاری ہو گئی اور میں لیٹ گیا۔ کافی دور نکل کر میری آنکھ کھلی۔ کار تیزی سے اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑ رہی تھی سورج غروب ہو چکا تھا"

آگے چل کر علی صاحب لکھتے ہیں :-

"نیپلز میں ہم لوگ دس دن تک ٹھیرے۔ اب کچھ بھی دیکھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ تمام دن کیمپ میں پڑا رہتا۔ نہ کسی سے بولتا اور نہ کسی کے پاس آتا جاتا۔ دس دن کے بعد وہاں سے ٹوینو کی بندرگاہ پر آئے اور میں جہاز میں اپنے تمام ارمانوں کا خون کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی روز جہازوں کا قافلہ جس میں چوبیس بڑے سواری والے جہاز تھے، بیس حفاظتی تھے، ہندوستان

کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک بار خطرے کا الارم ہوا لیکن کوئی خاص گڑبڑ
نہ ہوئی اور ہم صحیح و سلامت سکندریہ کی بندرگاہ پر پہنچے، وہاں سے ٹرین کے
ذریعے قاہرہ پہنچے۔ پانچ روز قیام کے بعد وہاں سے ہندوستان کو روانہ ہوئے
اور بائیس دن کے سفر کے بعد چار سال کا لمبا عرصہ گذار کر پہلی مرتبہ بمبئی کی بندرگاہ
پر قدم رکھا۔ بمبئی سے اپنے ڈپو بریلی گیا۔ وہاں سے تین مہینے کی چھٹی پر آیا۔ والدہ
اس دوران میں بہت ہی ضعیف ہوگئی تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔
اور ایک مہینے میں اچھی ہوگئیں۔ ایک روز چھوٹا بھائی فیروزپور سے آیا۔ اس دن
ہم پانچوں بھائی گھر پر موجود تھے۔ والدہ نے ہمیں پانچوں کو دیکھ کر بڑے بھائی
صاحب سے کہا کہ سخاوت اب تم سب جوان ہو اور میری آنکھوں کے سامنے
موجود ہو۔ میرے لئے آج زندگی میں سب سے زیادہ خوشی کا دن ہے تمہارے
باپ کے مرنے کے بعد جو میں نے تمہارے لئے مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ آج سب
آسان ہوگئی ہیں۔ اب مجھے کوئی غم نہیں۔ خواہ میں اب کل ہی کیوں نہ مرجاؤں
والدہ صاحبہ کی اس وقت کی دعا قبول ہوگئی اور دوسرے ہی روز بخار
ہوا اور ایک ہفتہ بیمار رہنے کے ہمارے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئیں
انا للہ وانا الیہ راجعون"

اس حادثے کے بعد علی صاحب کو پھر برما کے محاذ پر جانا پڑا جہاں کا ذکر
انھوں نے اسی تفصیل سے کیا ہے جس طرح یورپ کی جنگ کا۔ سنگاپور، رنگون اور
مانڈلے وغیرہ میں انھیں کیسی کیسی ارضی اور سماوی بلاؤں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ اپنی جگہ
ایک طویل رپورتاژ ہے۔ آخر کار جاپان نے ہتھیار ڈال دئے۔ اس کے بعد ایک در

محاذ جنگ کا نقشہ ان کی سرگزشت میں ملتا ہے جس میں علی صاحب بار ہا موت کے منھ سے بچے اور آخر کار زخمی ہو گئے۔ لکھتے ہیں۔

"میں ایک بڑے حملے میں زخمی ہو گیا اور واپس ہندوستان آگیا۔ میرا دل چونکہ اُکتا گیا تھا اس لئے آتے ہی "ریلیز" ہو جانے کے لئے رپورٹ کر دی۔ پانچ مہینے کے بعد بڑی مشکل سے فوج سے نام کٹا۔ اور گھر واپس آ گئے"

علی صاحب نے یہاں پہنچ کر کچھ اپنی خانگی قسم کی الجھنوں اور پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے جس میں ان کے والد کے انتقال کے بعد ان آٹھ بھائی بہنوں کے مختلف قسم کے نجی مسائل۔ ان کے گاؤں والوں کی ان کے بہنوئی کے ساتھ دشمنی اور پھر عجیب و غریب قسم کی مجبوریوں کے تحت محض بڑی بہن کی خوشنودی طبع حاصل کرنے کے لئے شادی کر گزرنے کے ایثار کا واقعہ درج ہے۔ شادی کا حادثہ یوں ہے:۔

"آخر کار میں نے ہاں کرلی اور شادی ہو گئی۔ میں جس وقت گھر واپس آیا تو آکر مجھے کلارا کا خط ملا بمعہ فوٹو کے۔ مجھے خط ملتے ہی انتہا درجے کا افسوس ہوا اور بہت پریشان رہنے لگا کہ اب کیا کروں"

علی صاحب نے اس کے بعد سپاہیانہ عزم کے ساتھ فیصلہ کیا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمایا جائے تاکہ کلارا کو اٹلی سے بلانے یا کلارا کے پاس اٹلی تک پہنچنے کی سبیل نکلے۔ انھوں نے کلارا کو اپنے کسی خط میں یہ نہ لکھا کہ ان کی شادی ایک حادثے کے طور پر ہو گئی۔ علی صاحب کو آج تک یہی ڈر ہے کہ کلارا اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے گی۔ کلارا ان کو برابر خط لکھتی رہی جن میں سے بعض کا ترجمہ انھوں نے اپنے الفاظ میں اپنی سرگزشت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ان تراجم کو پڑھ کر علی کے لئے کلارا

کے بے پناہ خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ صرف ان خطوط ہی سے ایک بے انتہا اور بے پایاں محبت کی داستان مرتب ہوتی ہے۔ ایسی داستان جو ازل سے دہرائی جا رہی ہے اور کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ قالب بدلتے رہتے ہیں۔ انداز بیان میں اختلاف ہوتا رہتا ہے لیکن ہر قصے میں ایک ہی روح کارفرما رہتی ہے۔ کلارا نے علی کو اس نو برس کے عرصے میں بے شمار خطوط تحریر کئے ہیں اور شاید تا زیست وہ انھیں یونہی لکھتی رہے گی لیکن یہ منظر عام پر کبھی نہ آسکے کیونکہ ان خطوں میں کسی مشاق انشا پرداز کے جھوٹ کا حسن شامل نہیں۔ وہ دلفریب اور دلکش جھوٹ جو شعر و ادب کی جان ہے اور پھر علی صاحب کے ساتھ تو دشواری یہ ہے کہ ان کی محبوبہ کی زبان اطالوی ہے اور انھیں اطالوی نہیں آتی۔ اب یہ محبت کا جادو ہے کہ بولی چاہے پنجابی ہو یا اطالوی چاہے آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن بقول جگر مرادآبادی کبھی کبھی اورائے سخن بھی ایک بات ہوتی ہے اور اس نظر سے ہر بولی میں محبت کو سمجھا جا سکتا ہے "مجنوں کی ڈائری کے چند اوراق پڑھنے کے بعد "لیلے" کے خطوط بھی ملاحظہ کیجئے۔ یہ خطوط اٹلی اور چیکوسلوواکیا کے مختلف مقامات سے تحریر کئے گئے ہیں۔ مقامات کے نام چونکہ تمام خطوط کے تراجم پر درج نہیں ہیں۔ اس لئے میں صرف تاریخ وار کہیں کہیں سے ضروری اقتباسات ان خطوط کے نقل کر رہا ہوں تاکہ تصویر کے اس رخ سے بھی آپ کسی حد تک آگاہ ہو سکیں۔

(۱) ۱۷ دسمبر ۱۹۵۵ء

"کل تمہارا ایک خط ملا اور آج ایک تار بھی۔ میں نے تو بہت خط لکھے لیکن تم نے صرف ایک ہی لکھا اور وہ بھی بہت عرصے کے بعد۔ میں تو بہت روئی تھی کہ شاید تم بھول گئے ہو۔ میں ہر وقت یہی سوچتی تھی کہ کہیں تم کسی اور کو پیار کرنے لگے۔ میرا یہ وقت

بہت کٹھن گزرا خط جلد لکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ خط ملنے سے پہلے تیری بدنصیب کلارا مر جائے۔"

(۲) ۱۶ر جنوری ۱۹۶۷ء

"پیارے علی مجھے بھی میری طرح یاد رکھنا۔ جب میں ہر وقت تیری یاد اپنے دل میں لئے ہوئے ہوں۔ میں ہر وقت تیرے نزدیک رہنا چاہتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تیرے دل کی ایک ایک دھڑکن میرے لئے ہو۔ کون جانتا ہے کہ میرے دل کی آہ تجھ تک پہنچتی بھی ہے یا نہیں۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

(۳) ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۶ء

جب تک تیرا خط نہیں آجاتا روتی رہتی ہوں۔ میری دنیا تیری محبت کے بغیر بالکل خالی ہے۔ مجھے ہر وقت یہی ڈر رہتا ہے۔ کہیں یہ عمر بھر کا رونا نہ ہو جائے۔"

(۴) ۷ر جنوری ۱۹۶۷ء

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ تمہیں پا لوں گی۔ نہیں ابھی تک شادی نہیں کی شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم تو وہاں بیٹھے ہو شادی کس سے کر لیتی۔ اس کا تو تم وہم بھی نہ کرنا۔ مجھے جس چیز کی آرزو ہے وہ شادی کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ مجھے تو میرا علی چاہیئے۔ میرے دل میں تم نہیں۔ میرے دل میں میرا علی ہے۔"

(۵) ۲ر فروری ۱۹۶۷ء

"تم میری پہلی اور آخری اور بے مثل محبت ہو۔ فاصلہ یقیناً بہت ہے لیکن اس کے باوجود بھی تمہیں دوبارہ دیکھنے کی خواہشمند ہوں۔ تم مجھے بہت کم لکھتے ہو۔

شاید تم نے کسی دوسری لڑکی سے محبت شروع کر دی ہے۔ نہیں یہ کبھی نہیں ہوگا میرے پیارے میں یہ کبھی برداشت نہ کر سکوں گی۔"

(۶) ۲۴ر فروری ۱۹۶۷ء

"کیا تم میرا فوٹو ہر وقت اپنے پاس رکھتے ہو لیکن اب میں بہت بدل چکی ہوں۔ اُس وقت میری عمر صرف تیرہ برس کی تھی اب ایک میٹر اور ۷۰ سینٹی میٹر میرا قد ہے میرا اپنا اندازہ ہے کہ تم بھی کم از کم ایک میٹر پچیاسی سینٹی میٹر ضرور ہو گے۔ میں ہر وقت تمہیں اپنے نزدیک پاتی ہوں۔ اور رات کو ہمیشہ خواب میں دیکھتی ہوں۔ نہ معلوم یہ خواب کب سچے ہوں گے۔ شاید کبھی نہیں ـــــــ تم مجھ سے دریافت کرتے ہو کہ کیا میں ہندوستان آنا چاہتی ہوں۔ میرے پیارے علی ہندوستان کو کیا میں تمہارے ساتھ دوزخ میں بھی جانا پسند کرتی ہوں۔ میں تو ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا پسند کرتی ہوں، خواہ کہیں بھی کیوں نہ ہو تم۔ میں دوسری لڑکیوں کی طرح آوارہ نہیں ہوں۔"

(۷) ۱۶ر جولائی ۱۹۶۷ء

میرے پیارے جان سے زیادہ عزیز دوست، میرے حال پر رحم کرو اور جلد آنے کی کوشش کرو۔ ورنہ تم اپنی کلارا کو کبھی نہ دیکھ سکو گے۔"

(۸) ۲۸ر نومبر ۱۹۶۷ء

میں تمہیں آج خوشی کی بات سنانا چاہتی ہوں وہ یہ کہ میں اب بہت تبدیل ہو گئی ہوں۔ اس وقت سے جب سے تم نے مجھے پہلی بار دیکھا تھا۔ اب بہت ہی خوبصورت ہو گئی ہوں۔ جب آئے میں ایک بچہ تھی لیکن اب پورے اکیس برس کی ہوں اور

قد بھی بڑھ گیا ہے اور بہت ہوشیار ہو گئی ہوں۔ جب میں راستے میں چلتی ہوں تمام جوان لڑکے مجھے گھورتے ہیں لیکن میں کبھی نظر اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھتی۔ کیونکہ میرے دل میں تو ہر وقت تیرا خیال ہے۔"

(۹) ۱۶ر دسمبر ۴۷ء

میرا یہ وقت بہت ہی کٹھن گذرا۔ پانچ سال گذر گئے ہیں۔ جب تم یہاں سے چلے گئے ہو۔ میں نے ہر وقت تیرا انتظار کیا لیکن اب بہت تھک گئی ہوں۔ میں تیرے پاس آنا چاہتی ہوں۔ تو جانتا ہے علی کہ میں تیری طرح غریب ہوں، کچھ بھی تو میرے پاس نہیں سوائے جان کے اور جو کچھ ہے صرف تیرے لئے ہے میرے پیارے علی کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ اٹالین یا انگریز سفیر جو کہ ہندوستان میں رہتا ہے اُس سے جا کر دریافت کرو کہ میں ایک اٹالین سے شادی کرنا ہوں اور اُسے ہندوستان لانا چاہتا ہوں۔ پھر لکھو کہ وہاں سے کیا جواب ملتا ہے اگر یہ ممکن نہ ہو سکا کہ ہم ساتھ رہیں تو پھر زندہ نہ رہوں گی۔ جب زندہ ہی نہ رہونگی تب شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے لبریز رہتی ہیں۔

(۱۰) ۳۱ر دسمبر ۴۷ء

"تم ہر وقت یہی لکھتے ہو کہ میں غریب ہوں لیکن میں ہر وقت یہی کہتی ہوں کہ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تم امیر ہو۔ تم مجھے ایسا دوبارہ نہ لکھنا۔ تم شاید یہ خیال کرتے ہو کہ میں دولت چاہتی ہوں۔ نہیں کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں اور تمہاری محبت کو۔ بس صرف ایک چھوٹی سی

جھونپڑی اور وہ تمام محبت جو میرے لیئے ہے۔ میرے لئے صرف تیرا دل اور
تیری محبت کافی ہے۔ سمجھے۔ حالانکہ میں بھی تیری طرح غریب ہوں لیکن میں یہ نہیں
چاہتی کہ تم ایک بہت بڑے مالدار ہوتے۔ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں علی اور
میں کسی کو اپنی زندگی میں نہیں گنتی۔ میری زندگی تیرے بغیر کیا ہو گی میں کبھی بھی کسی
دوسرے آدمی سے محبت نہیں کروں گی۔ اور میں کبھی کسی دولت مند انسان کے
ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اور نہ کسی امیر کو چاہتی ہوں۔ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں
کہ میری روح ہو۔ آخر اب تم ہی بتاؤ ایک انسانی ڈھانچہ بغیر روح کے کیسے زندہ
رہ سکتا ہے کیا ایسا ہو سکتا ہے نہیں کبھی نہیں، تو بس میں بھی تمہارے بغیر زندہ
نہیں رہ سکتی۔ میں پاکستان آنے کے لیئے بہت مضطرب ہوں کسی قسم کا ڈر محسوس
نہیں کروں گی۔ میں کوئی بچہ تھوڑی رہی ہوں جس طرح تم کہتے ہو میں اسی طرح
کرنے کو تیار ہوں لیکن اب زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی۔ میں جہاں کہو گے
آنے کو تیار ہوں۔ میں کوئی بھی اچھی چیز اپنے لئے نہیں مانگتی۔ تم ہی میرے لیے
سب کچھ ہو اور بس! خدا وہ دن جلد لائے گا کہ ہم ایک دوسرے کے نزدیک ہوں گے
اور کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑیں گے اور ہمیشہ خوش رہیں گے اور میں
تمہیں خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گی اور میں ہر ممکن تمہاری خدمت
کروں گی، جو کہ ایک عورت اپنے مرد کے لئے کر سکتی ہے اور جب تم سمجھو گے کہ
مجھے تمہاری کتنی بے لوث محبت ہے۔ میں ہر وقت تیری رہی اور ساری عمر تیری
رہوں گی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو، میرے لئے میری
طرح، اور اپنے سے زیادہ مجھ سے محبت کرو اور تم ہر وقت میرے لئے ہو۔

تمام عمر اور مرنے کے بعد بھی۔"

(۱۱) یکم اپریل ۱۹۴۸ء

"کل اٹلی سے بڑی بہن کا خط آیا ہے لکھتی ہیں۔ چند دن میں میں ارجنٹائن امریکہ جا رہی ہوں شاید میں بھی ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ علی کیا تم پہلے کی طرح محبت کرتے ہو۔ بھولنے کی کوشش تو نہیں ـــــ کر لیے ہو۔"

(۱۲) ۲ر دسمبر ۱۹۴۸ء

"میری آواز ایک بلند اور سریلی آواز ہے اور اگلے سال میں بڑے میوزک اسکول میں داخل ہوں گی اور پھر کچھ عرصے بعد ریڈیو اسٹیشن پر گانا شروع کروں گی۔ کیا تم خوش ہو اور جب میرے پاس کافی روپیہ جمع ہو جائے گا۔ تب تیرے پاس آؤں گی۔"

(۱۳) ۱۰ر جنوری ۱۹۴۹ء

اس دن سے جب سے تم مجھے اس دنیا میں، جو میرے لئے بہت ہی بھیانک ہے ایک درد بھرے دل کے ساتھ اکیلا، بے سہارا چھوڑ گئے تھے۔ کافی عرصہ گذر چکا اس درد نے مجھے آج تک اکیلا نہیں چھوڑا۔ کتنا وفادار ثابت ہو رہا ہے یہ۔ یہ درد کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔"

(۱۴) ۳ر فروری ۱۹۴۹ء

میرے پیارے علی: میں چاہتی ہوں تم اٹلی آ جاؤ۔ یہاں آنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ کتنا خوبصورت ملک ہے یہ، اور پھر ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ ہاں واپس آ جاؤ، میں نے اپنا ایک ریکارڈ بھی بھروایا ہے جو کہ بہت ہی اچھا ہے اور جب میں اُسے سنتی ہوں تو یہ خیال آتا ہے کہ کاش

تم اسے سن سکتے۔ اور پھر کتنے خوش ہوتے ۔۔۔ اگر تمہارا آنا ممکن نہ ہو سکا تو پھر جب میں گانا اچھی طرح سیکھ جاؤں گی۔ تب روپیہ جمع کر کے تمہیں لینے کیلئے آؤں گی اور پھر تمام دنیا کی سیر تمہیں ساتھ لے کر کروں گی۔ مجھے بہت سی باتیں لکھنا ۔۔۔ جب تم میری آواز سنو گے تو کتنے خوش ہو گے۔ خط ختم کرتی ہوں لیکن تیرے خیال کو نہیں ''

(۱۵) ۴ اپریل ۴۹ء۔

''یہ تنہائی کی راتیں بھی کس قدر بھیانک ہوتی ہیں۔ دن تو کسی نہ کسی طرح گذر جاتا ہے لیکن رات خدا کی پناہ ایک ایک سیکنڈ گذارنا مشکل ہوتا ہے۔ علی! وہ دن کب آئے گا جب یہ کالی اور بھیانک گھٹائیں جو میری زندگی پر چھائی ہوئی ہیں، دور ہوں گی اور میں بھی دنیا والوں کی طرح ہنسوں گی اور خوشی سے اپنے دن گذاروں گی دعا کرو میرے علی! یا تو خدا موت دے یا پھر دل کی تمناؤں کو پورا کر دے ۔۔۔ کاش میں بچپن ہی میں مر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

(۱۶) ۳۰ مئی ۴۹ء

''مجھے ایک بہت لمبا خط لکھنا کیونکہ صرف تیرے خط ہی مجھے میری اندھیری زندگی میں تھوڑی بہت روشنی دیتے ہیں ''

(۱۷) ۱۱ اگست ۴۹ء

''تم لکھتے ہو کہ میں واپس اٹلی چلی جاؤں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اپنی ملازمت کیسے چھوڑ دوں ۔۔۔ اسے چھوڑ دوں تو ضروریات زندگی کیسے پوری ہوں گی میرا باپ وہ بالکل بوڑھا ہو چکا ہے اور اس لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اور بھائی

میری مدد کو تیار نہیں .... میرا باپ آج کل ایک چھوٹے سے
گاؤں میں رہتا ہے اور مجھے وہاں کوئی کام نہیں مل سکتا جس سے زندگی کے
دن گذار سکوں اس لیے وہاں جانے پر میری مصیبتوں میں اور بھی اضافہ ہو جائیگا
ایک تیری محبت کا غم ہی کیا کم ہے۔ میری ایک بڑی بہن جو اٹلی میں تھی وہ انجان
چلی گئی ہے۔ اگر اس نے کبھی سفر خرچ بھیجا تو میں بھی اس کے ساتھ جا کر رہوں گی
میں کبھی شادی نہیں کروں گی کیونکہ سوائے تمہارے کسی بھی آدمی کے ساتھ
خوش نہیں رہ سکتی۔ یا تم سے شادی کروں گی یا پھر کسی سے بھی نہیں تم
لکھتے ہو کہ تم میرے لئے روپے بھیج سکتے ہو لیکن مجھے ان کی ضرورت نہیں
کیونکہ اگر فرض کرو کہ تم بھی اٹلی نہ آسکے اور میں بھی تمہارے پاس نہ پہنچ سکی تو
تمہاری نظروں میں میری کیا عزت رہ جائے گی اور یہ اتنا بڑا جرم ہوگا جس کی
تلافی ساری عمر نہ ہو سکے گی۔ میں تمہاری اور زمانے کی نظروں میں ایک مجرم
کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتی مجھے تم سے محبت ہے نہ کہ روپیوں سے
یہ تو مجھے یقین ہے کہ تم مجھے میری مجبوریوں کی وجہ سے معاف کر دو گے لیکن
علی ان لوگوں کی زبانیں جن کو یہ معلوم ہوگا کہ میں تمہارے روپے لے کر
کھا گئی اور تمہیں دھوکا دیا کیسے بند کرو گے۔ اُن لوگوں کی نظروں میں
میری کیا حقیقت ہوگی اور پھر تمہیں ہمیشہ طعنہ زنی کرتے رہیں گے۔ علی
میں یہ نہیں چاہتی کبھی نہیں چاہتی کہ تیرے دل میں میری طرف سے کوئی
برائی آئے اور لوگوں کے کہنے سننے سے بھی تم مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ
تمہاری جدائی کا غم برداشت کر رہی ہوں لیکن یہ مجھ سے کبھی برداشت

نہ ہوگا کہ تم مجھے اس لئے بھلا دو کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا اور تم یہ سمجھنے پر
مجبور ہو جاؤ کہ میں ایک آوارہ لڑکی تھی اور میری محبت وقتی تھی۔ اس سے
پہلے کہ تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی شک و شبہ ہو میں مرجانا چاہتی
ہوں ـــــ موسم بہار میں میں شاید اٹلی جاؤں لیکن وہاں زیادہ سے زیادہ
ایک مہینہ ٹھیروں گی۔ فادر انتونیو سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوگی مجھے لکھنا کہ
وہ کب وہاں ہوگا۔"

(۱۷) ۱۷ر نومبر ۱۹۴۹ء

"میں فادر انتونیو کو لکھنا چاہتی تھی لیکن اس کا پتہ گم ہوگیا۔ تم فادر انتونیو کو میرا
اٹلی کا پتہ بھیج دینا تاکہ وہ تمام چیزیں میرے بھائی تک پہنچا سکے۔ تم نے فادر
انتونیو سے کہا تھا کہ یہ چیزیں ماسوائے کلارا کے کسی اور کو نہ دینا۔ ان کو یہ
کہہ دیتے کہ یہ سب چیزیں میرے گھر تک پہنچا دیتے۔ علی میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔
مجھے تمہارے اس فوٹو کی ضرورت ہے جو تم نے میرے لئے بھیجا تھا۔ اگر فادر
ابھی تک اٹلی واپس نہ آیا ہو تو اُسے لکھ دینا کہ یہ سب چیزیں ایک پارسل کے ذریعے
میرے گھر تک پہنچا دے ـــــ تم مجھ سے کئی دفعہ دریافت کر چکے ہو کہ آیا
میں پاکستان آنا چاہتی ہوں یا نہیں۔ میرا جواب ہمیشہ ایک ہی رہا لیکن تم
پھر بھی پوچھتے ہو۔ میں ہر وقت حاضر ہوں۔ میں تمہارے نزدیک رہنا چاہتی ہوں۔"

(۱۸) ۶ر اگست ۱۹۵۱ء (تا دم تحریر علی کے نام یہ کلارا کا آخری خط ہے)

"تمہارا محبت نامہ مدت کے بعد ملا۔ میں نے بھی بارہا کوشش کی کہ جواب لکھ سکوں
مگر میرا قلم اس کوشش میں ناکام رہا۔ وجہ صرف اس قدر تھی کہ میرا ضمیر تمہیں

سب سے زیادہ پریشان خط تحریر کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا اور تم تک یہ غم انگیز خبر پہنچانا بھی نہ چاہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ کاش تم مجھے ہمیشہ کے لئے فراموش کر چکے ہوتے۔ کاش مجھ بدنصیب کی قسمت میں ایسا ہوتا یقین تم اپنی بدنصیب کلارا کو ہنوز یاد کرتے ہو اور یہی وہ خیال ہے جو میرے لئے اب سوہان روح ہے۔ یہ میں سمجھتی ہوں کہ میرا یہ خط تمہیں کس قدر تکلیف پہنچائے گا۔ تم میرے خط کے انتظار میں ہو کہ شاید یہ تمہارے غم کو غلط کر سکے۔ مگر میں تم سے وہ کہنے کی جرأت کر رہی ہوں جس کے سننے کو شاید تمہارے کان تیار نہ ہوں لیکن ہے کہ یہ تمہیں سکون پہنچا سکے یوں تو دل میں بہت کچھ تھا کہ ضبط تحریر ہوتا۔ مگر اب تو صرف ایک ہی بات ہے اور وہ یہ، وہ یہ کہ میں نے ازدواجی زندگی اختیار کر لی ہے میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے یہ کبھی تحریر نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور یہ بھی جانتی ہوں یہ سن کر تمہارے دل پر کیا گزرے گی اور مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ میرا یہ فعل ایک فاش غلطی ہے۔ علی تم یقین کرنا میں یہ غلطی کر کے سخت خسارے میں رہی ہوں تصور تو کرو کہ میری زندگی کتنی بے کیف اور مضمحل ہے۔ تم کیا جانو کہ میری زندگی کے کتنے سال یونہی گزر چکے ہیں۔ اکیس برس۔ مگر یہ جوان زندگی ـــــ یہ جوانی میرے لئے عذاب مسلسل ہے۔ اور کون جانے یہ عالم کب تک رہے۔ شاید میں اس گہرے غار سے کبھی نہ نکل سکوں ـــــ تمہارے سوا میرا اس دنیا میں ہے کون ـــــ جس کے سامنے اپنا دکھڑا رووں۔ علی میں تمہارے خط کے انتظار میں رہوں گی۔ مجھے وہ کچھ لکھو جو ایسے ٹوٹے ہوئے دل کو تھوڑی سی تسلی دے سکے۔ کاش تم سمجھ سکو کہ تمہارے خط کتنے

مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ میری زندگی کا کیا حشر ہوگا اور میرے دل کا یہ درد جو ایک پل بھی چین نہیں لینے دیتا کب ختم ہوگا۔ اپنی زندگی کے دن یونہی پورے کر رہی ہوں۔ میں کس قدر رونے کی کوشش کرتی ہوں مگر رو بھی نہیں سکتی۔ کمبخت ان آنکھوں میں آنسو بھی تو نہیں رہے ——— میری روح میں ایک خلا ایک ویرانی سما چکی ہے ——— میرے سکون کا مداوا اب صرف موت ہی ہے۔ حال بھی اتنا ہی تاریک اور بھیانک ہے جتنا کہ ماضی تھا۔ میں بالکل اکیلی اور ویران ہو گئی ہوں ——— ملی کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گے مجھے ازدواجی زندگی کا سہارا صرف اس لئے لینا پڑا کہ میں یکہ و تنہا و بے سہارا ہو چکی تھی۔ اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جو میری مدد کر سکے۔ نہ اطالیہ واپسی کی کوئی راہ تھی ——— ذرا تصور تو کرو ایک غریب الدیار، جوان عورت کس حد تک اکیلی بے یار و مددگار زندگی کے دن گذار سکتی ہے اور آج بھی میرا یہی خیال ہے کہ میں ان حالات میں تنہا نہ رہ سکتی تھی مجھے ایسے انسان سے شادی کرنی پڑی کہ محبت تو ایک طرف میں اس کو اس سے قبل جانتی بھی نہ تھی۔ ہاں اس شادی کا اہم نتیجہ اس وقت تک تو صرف یہ ہے کہ میری پریشانی ایک دم انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ میں آج اُس پریشانی میں مبتلا ہوں کہ جس کا شائبہ تک بھی مجھے کبھی نہ ہو سکتا تھا میرا اسلام محبت قبول ہو۔

بالکل پہلے کی طرح

کلارا

کہیں کہیں سے "مجنوں کی ڈائری" اور "لیلےٰ کے خطوط" کے یہ اقتباسات پڑھنے کے بعد ہر چند کہ نفس مضمون ان کا قاضی عبدالغفار کی ان دونوں تصانیف سے یکسر

مختلف ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ ؎

ایسے قصے ہزاروں ہوتے ہیں
یوں کہیں مرد وے بھی روتے ہیں

لیکن سوال صرف یہ ہے کہ کتنی ایسی داستانیں محض اس لئے قعر گمنامی میں دفن ہو جاتی ہیں کہ انھیں نواب مرزا شوق کا سا بیان کرنے والا نصیب نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ اگر میراجی ہوتے تو علی اور کلارا کی داستان، بہتر طریقے سے آپ تک پہنچتی، اور اس قصہ کا یہ انجام نہ ہوتا جو اب آپ کو نظر آ رہا ہے۔ میراجی کے ملنے والے ہومیوپیتھک طبیب ڈاکٹر فرزوق اور ان کے دوست حافظ عبدالرحمٰن صاحب چاہتے ہیں کہ اس کہانی کو یا تو ناول کی شکل میں لکھ دیا جائے یا پھر کسی فلم کمپنی کے لئے اس کا "سناریو" تیار کیا جائے لیکن یہ کام کچھ وہی حضرات انجام دے سکتے ہیں جن کے پاس عبدالحلیم شرر کی سی فرصت یا فلم سناریو لکھنے والوں کا سا دماغ ہو۔ اگر کسی صاحب کو یہ دونوں نعمتیں میسر ہوں تو ابھی اس قصے کی بہت سی اہم کڑیاں انھیں بتائی جا سکتی ہیں۔ جن کا ذکر اصل میں مجھے ہی کہیں کر دینا چاہیے تھا۔ مثلاً ایک تو بڑی ضروری بات یہ ہے کہ ۶ر اگست ۱۹۵۱ء کا کلارا کا خط جب علی کے پاس پہنچا تو انھوں نے کفا جفا کر کے کسی نہ کسی طرح اٹلی تک پہنچنے کا کرایہ جمع کر لیا تھا اور پاسپورٹ کے لئے درخواست دے دی تھی۔ دوسرے ۱۹۵۰ء میں پورے سال بھر جو انھیں کلارا کا کوئی خط موصول نہیں ہوا اس کی وجہ یہ کہ فادر انتونیو اٹلی کے ایک پادری صاحب یہاں پاکستان میں کسی نہ کسی طرح علی صاحب سے ملے اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ یہ ریلوے کا ایک ٹکٹ کلکٹر جو مسلمان ہے ایک اٹلی کی عیسائی لڑکی پر فریفتہ ہے تو انھوں نے یہ سارا قصہ گویا مذہب کی عینک سے

دیکھا اور اٹلی کی پہنچ کر کلارا اور علی کے درمیان مذہب کی صلیب کھڑی کر دی لیکن محبت نے اس صلیب کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھانا گوارا کیا اور پادری صاحب آخر کار پست ہو کر بیٹھ گئے۔ وغیرہ ـــــ لیکن ان ساری تفصیلات سے کسی مصنف کو صرف اسی وقت آگاہ کیا جا سکتا ہے جب کوئی حریفِ مے مرد افگنِ عشق نظر آئے۔ گو ہے مکرر لبِ ساقی پہ صدا۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق !!

(ماہنامہ ادبی دنیا، نومبر ۱۹۵۲ء)

عِصمت

ضدّی بیٹی، سعادت مند بہو، مارے خلوص کے بات بات پر میاں سے لڑنے والی
بیوی، ماممتا ظاہر نہ ہونے دینے والی ماں اور اسم با مسمیٰ ——— یہ ہیں عصمت، جنھیں لوگ
عصمت چغتائی کے نام سے بھی جانتے ہیں اور عصمت شاہد لطیف کے نام سے بھی۔ عصمت
نہ خوبصورتوں میں شمار ہو سکتی ہیں اور نہ بدصورتوں میں، درمیانے درجے کا دُہرا ڈیل، طویل القامت
اور متناسب الاعضا، عام طور سے بیمار رہنے اور علاج نہ کرنے کی قائل، کھلتا ہوا گیہواں
رنگ، جو اب بمبئی میں رہتے رہتے زیادہ سنولا گیا ہے۔ موتی کی لڑی سے دانت، جو پان کھاتے
رہنے کے باوصف کتھے چونے کا اثر قبول نہیں کرتے، پتلے پتلے ہونٹ، مختصر سی ناک اور بھرے
بھرے رخسار جتنے سلجھے ہوئے خیالات، سر پر اُتنے ہی اُلجھے ہوئے بال، متجسس آنکھیں اور
آنکھوں پر سونے کے فریم کی محدب شیشوں کی عینک، مجموعی طور پر چہرے سے ذہانت
اور طباعی کے آثار نمایاں، ہنس مکھ اور تند مزاج، لکھنے پڑھنے میں جتنی بے باک، بات چیت
میں اُتنی ہی محتاط، بقول بڑی بوڑھیوں کے پہننے اوڑھنے سے اچھی معلوم ہو سکتی ہیں لیکن
عام طور پر صرف تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے پہنتی ہیں، آرائش یا زیبائش کے خیال سے
نہیں، گہنے پاتے اور بناؤ سنگھار سے کتراتی ہیں، کبھی کبھی غرارہ یا شلوار بھی پہنتی ہیں لیکن ان کا
من بھاتا لباس ساڑھی ہی ہے۔ بھڑکیلے اور قیمتی لباس نہ خود پہنیں، نہ دوسروں کو پہنے

دیکھ سکیں۔ کھانے پینے کی شوقین کم، اور کھانے پکانے کی زیادہ۔ گھر گرہستی کے کاموں میں اتنا انہماک برتتی ہیں کہ اگر آپ اِن کے گھر جایئے تو کچھ نہ کچھ سیتا پروتا ہی پایئے لیکن اس کے باوجود انھیں سڑک یا کسی اور پبلک مقام میں ہاتھ میں اون کے گولے یا سلائیاں لئے نہیں دیکھا گیا۔ مطالعہ کرتے آج تک نہیں پکڑی جاسکیں۔ انھیں کتابیں پڑھنے کا کم اور زندگیاں پڑھنے کا زیادہ شوق ہے۔ جہالت سے نفرت کرتی ہیں لیکن جاہل اور مفلوک الحال عورتوں میں گھس گھس کر بیٹھنے، اُن کے رنڈ رونے سننے اور اُن کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھنے کا جنون ہے۔ حتی الامکان اُن کی ہر ممکن مدد بھی کرتی ہیں اور موجودہ معاشرے کی غلط قسم کی بندشوں سے انھیں آزاد کرانے کی کوشش بھی۔

خود اپنے میاں سے جاہل عورتوں کی طرح لڑتی ہیں اور شاید ان سب جاہل عورتوں کا بدلہ شاہد لطیف صاحب سے لیتی ہیں جو بعض غلط قدیم روایات کے دباؤ سے پِس کر اپنے جائز حقوق کے لئے بھی اپنے اپنے شوہروں سے لڑنے پر قادر نہیں۔ میاں سے لڑکر عام طور پر میکے کا رُخ کرتی ہیں اور جب تک میاں خود منانے نہ آئیں روٹھی ہی رہتی ہیں۔ اگر آپ کسی موضوع پر ان سے کوئی بحث چھیڑ بیٹھیں تو پھر جب تک آپ کو قائل نہ کرلیں یا خود قائل نہ ہوجائیں، بحث ختم نہیں کرتیں لیکن خود کسی بحث کا آغاز بہت کم کرتی ہیں اور شاعروں سے زیادہ نثر نگاروں سے بحث کرنا پسند کرتی ہیں۔

پیدل چلنے سے گھبراتی ہیں لیکن اگر چلنا ہی پڑے تو پھر میلوں کی مسافت باتوں باتوں میں طے کر جاتی ہیں۔ اپنی تحریروں کا معاوضہ خود طلب نہیں کرتیں، ہاں اگر کوئی معاوضہ دینے پر آمادہ ہی آئے تو پھر اس پر کبھی کبھی ناراض بھی ہوجاتی ہیں کہ معاوضہ کم ہے اور بِجز بِنہ ہوکر کم ہی معاوضہ قبول کرلیتی ہیں۔ جاہل اور پسماندہ عورتوں کی حالت پر خود کڑھتی

رہتی ہیں لیکن انھیں خود اپنی حالت پر کڑھنے نہیں دیکھ سکتیں۔ انھیں بغاوت ہی کی تلقین کرتی ہیں۔

سب سے زیادہ تصنع سے جلتی ہیں۔ بلا کی فضول خرچ لیکن اگر تنگ دستی ہو تو اسی درجہ کی صابر و شاکر، پیسہ جب ہوتا ہے تو پانی کی طرح بہاتی ہیں، نہیں ہوتا تو غم غلط کرنے کے لئے افسانے اور ناول لکھتی ہیں۔ لکھتی عام طور پر فرش پر اوندھی لیٹ کر ہیں یا پھر اسی درجے سے پلنگ پر تکیہ پر کاغذ رکھ کر، میز کرسی کا استعمال کم کرتی ہیں۔ لباس عام طور پر جلدی جلدی تبدیل کرتی ہیں اور بہت عجلت میں، کپڑوں میں سادگی کے باوجود کسی نہ کسی حد تک COLOUR-SCHEME-کا خیال رکھتی ہیں۔

جب لکھنے بیٹھ جاتی ہیں بے تکان اور قلم برداشتہ لکھتی چلی جاتی ہیں۔ اور جب تک لکھنے سے دل برداشتہ نہ ہو جائیں لکھتی رہتی ہیں لکھتے وقت بظاہر گرد و پیش سے بے نیاز ہو جاتی ہیں اور بالعموم ایک نشست میں ایک افسانہ یا کسی ناول کا مکمل ایک باب لکھ کر دم لیتی ہیں کبھی اپنے لکھے پر نظر ثانی نہیں کرتیں اور ایک دفعہ کوئی لفظ یا کوئی فقرہ لکھ کر بہت کم قلم زد کرتی ہیں۔ افسانوں اور ناولوں میں افراد کے نام اور واقعات عام طور پر اصلی اور صحیح لکھتی ہیں اسی لئے اپنے جانب کار حلقوں میں "سعد اللہ" بن کر رہ گئی ہیں۔ سچی بات سعد اللہ کہیں، سب کے من سے اترے رہیں۔ عورتوں کو دماغی اعتبار سے مردوں کم تر نہیں سمجھتیں اور اپنے ملک کی عورتوں کے نکمے پن کی ذمہ داری مردوں پر نہیں خود اُن عورتوں پر رکھتی ہیں جو بلا وجہ مردوں سے دبی جاتی ہیں۔

اُردو ادب میں جتنی جلدی اور جتنا اہم مقام عصمت نے پیدا کیا اسی طرح ہندوستانی فلم میں بھی کم و بیش وہی اہمیت حاصل کر لی فلم کے لئے بھی عصمت نے اتنی ہی کامیاب کہانیاں

لکھیں جیسے ریڈیو کے لئے ڈرامے، لیکن چونکہ بہت جلد ہر چیز سے اکتا جاتی ہیں، اس لئے اب کچھ عرصے سے فلم کے لئے بھی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال عصمت اگر آئندہ کچھ بھی نہ لکھیں تب بھی انھوں نے اتنا ضرور لکھ دیا ہے کہ چاہے آپ اُردو ادب کا ذکر کریں یا ریڈیو اور فلم کا عصمت کا نام لئے بغیر چارہ نہیں، پھر بھی یہ ممکن نہیں کہ عصمت لکھنا بند کر دیں، وہ بغیر کھائے رہ جائیں بغیر لکھے نہیں رہ سکتیں اور کیونکہ زندگی کے بارے میں اُن کا ایک مستقل زاویۂ نظر ہے اس لئے جب تک پورا معاشرہ اُس زاویے پر نہ ڈھل جائے اُن کا کام ختم نہیں ہوتا۔

ادب برائے عاقبت

اسلامی ادب کیوں اور کیوں نہیں کے سلسلے کی ایک کڑی "ادب برائے عاقبت" بھی ہے۔ یہ نئی اصطلاح مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے دوست کی وساطت سے اپنے قارئین تک پہنچائی ہے۔ جس طرح "ترقی پسند ادب"، "رجعت پسند ادب"، "جنسی ادب" "غیر جنسی ادب"، "صحافتی ادب" اور "غیر صحافتی ادب" یا "ادب برائے ادب"، "ادب برائے زندگی" "ادب برائے فن" اور "ادب برائے نام" قسم کی بے شمار اصطلاحیں اب تک چل رہی تھیں وہاں "اسلامی ادب" اور پھر اس میں صالح ادب اور غیر صالح ادب کی تفریق نے یہ نیا شگوفہ کھلایا ہے ---!

"ادب برائے عاقبت" تک نوبت کیوں کر پہنچی اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے اور کیوں ہے۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اب تو سوال یہ ہے کہ اسلامی ادب پیش کیسے کیا جائے اور کس کے اسلام کو اسلام سمجھا جائے کیونکہ مختلف علمائے دین کے نزدیک اسلام ہی کا تصور مختلف ہے ---- مثلاً سید ابوالخیر مودودی کا اسلام کلیتاً مادی ہے۔ ابوالخیر صاحب کہتے ہیں کہ نماز کا مقصد یہ ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں پانچوں وقت مسلمان اس لئے جمع ہوں کہ انھیں دن میں پانچ مرتبہ ایک دوسرے کے حال سے کما حقہ آگاہی حاصل ہوتی رہے اور وہ جس حد تک ایک دوسرے کے دکھ درد میں ممکن ہو شریک ہو سکیں۔ پھر ہفتے میں

ایک مرتبہ ہر شہر یا گاؤں وغیرہ کی کسی بڑی مسجد میں اُس شہر یا گاؤں وغیرہ کے تمام محلوں کے مسلمان جمع ہوں اور ہر مسلمان باجماعت ہر ہر محلے کے انفرادی حالات سے آگاہ رہیں اور ایک دوسرے کی مساعدت کے لیئے امکان بھر تیار۔ اس کے بعد سال میں ایک مرتبہ حج بیت اللہ کے موقع پر تمام کرۂ ارض کے مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر دنیا بھر کے مسلمانوں کے مختلف النوع مسائل سے باخبر ہوتے ہیں ——— وغیرہ، روزہ ابوالخیر صاحب کے نزدیک نہ صرف اس لیئے ہے کہ مسلمانوں میں قوتِ برداشت پیدا ہو بلکہ وہ مسلمان جنھیں خس خانہ و برف آب کی سہولتیں حاصل ہیں آگاہ رہیں کہ جن کے پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہیں ہوتا اُن پر کیا گذرتی رہتی ہے۔ زکواۃ ایک خاص قسم کے معاشرے میں اقتصادی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیئے ہے۔ وغیرہ وغیرہ ——— ابوالخیر صاحب کے حساب سے ان مادی تصورات سے انکار اسلام کی رُوح کو نہ سمجھنے کے مرادف ہے اور ان مادی عبادات میں روحانیت کا تصور مسلمانوں کو اسلام کے اصل مقصد سے دور ہٹا دیتا ہے۔

ابوالخیر صاحب کے چھوٹے بھائی سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی کا اسلام کا تصور کچھ اور ہے۔ مولانا عبدلماجد دریابادی کا کچھ اور مولانا سید سلیمان ندوی کا اور ——— اور علیٰ ہذالقیاس۔

پھر خدا کا تصور بھی مختلف علمائے دین اسلام کا متفرق ہے۔ مرحوم مولانا مولوی احتشام الحق حقی صاحب دہلوی فرماتے تھے کہ خدا کو بجلی کے کرنٹ یا دو لٹیج کی سی ایک قوت سمجھو ——— جو کائنات کے ذرے ذرے میں (بقول فضلِ حق قریشی) جاری و ساری ہے اور اس کرنٹ سے جو کام تم چاہو لے سکتے ہو جس طرح بجلی کا کرنٹ اگر بجلی کے پنکھے

میں سے گزرے تو اس کی پنکھڑیوں کو گھما کر ہوا تمہاری طرف پھینکتا ہے، اگر ہیٹر میں سے گذرے تو حرارت پیدا کرتا ہے۔ کولنگ پلانٹ میں سے گزرے تو ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور بجلی کے بلب کو منور کرتا ہے ـــــــ اسی طرح وہ قوت جسے "رام کہو یا رحیم کہو" پوری کائنات میں اپنی کرشمہ سازیاں دکھاتی رہتی ہے۔

دلی والے مولانا مولوی عبدالسلام جو اسلامی فلسفے کے بہت بڑے معلم ہیں کہتے ہیں کہ خدا ایک وجدانی قوت ہے اور یہ وجدانی کیفیت جب کسی پر طاری ہوتی ہے تو وہ نہ پھر مسلمان رہتا ہے، نہ ہندو، نہ عیسائی رہتا ہے نہ یہودی بلکہ اس کل کا ایک جزو ہو جاتا ہے جس کو خدا کے نام سے پکارا جاتا ہے اور چونکہ خدا کسی مذہب کا پابند نہیں ہے اس لئے وہ انسان جس پر وجدانی قوت آشکارا ہو جائے کیسے کسی مذہب کا پیرو ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا کو ماننے بغیر بھی آدمی مسلمان رہ سکتا ہے اور خدا کو ماننے کے باوجود خدا کے منکر سے کسی طرح مختلف نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی فرماتے ہیں کہ خدا کا تصور اس لئے ضروری ہے کہ خدا پر یہ سمجھ کر ایمان لائے بغیر کہ وہ سچ مچ ہے کسی خیال میں مرکزیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور جب کسی خیال میں مرکزیت ہی پیدا نہ ہو تو کسی معاشرے میں کسی قسم کی نہ مادی اصلاح ممکن ہے نہ روحانی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کہتے ہیں کہ روحانیت بغیر خدا کے تصور کے پیدا نہیں ہوتی اور روحانیت کے بغیر مادی اصلاح ممکن نہیں جو بہت ضروری ہے اور روحانیت بغیر مادی اصلاح کے مفقود رہتی ہے۔

مولانا حسرت موہانی آخر وقت تک یہ کہتے رہے کہ اگر نظریۂ اشتراکیت میں خدا کا تصور شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام ہو جاتا ہے۔

اور علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ؎

ہزار یثرب میں آکے بیٹھیں وہ اپنے منھ کو چھپا چھپا کر
نگاہ عاشق کی ڈھونڈھ لیتی ہے پردہ میم کو اٹھا کر

خدا اور اسلام کے متنوع اور متفرق تصورات کے پیش نظر دین اسلام کے ایک طالب علم کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ شارحین اسلام میں سے کس کی بات مانے اور کیوں ؟ پھر یہ تو ہوئے وہ حضرات جنھوں نے براہ راست قرآن کریم اور احادیث نبوی سے اسلام اور خدا کے تصور کو سمجھا ہے۔ فرانس اور برطانیہ کے ادیبوں اور شاعروں کی مدد سے جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے ! ان کا "اسلام" ان سب سے مختلف ہے"۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اپنے "اسلامی ادب ! کیوں نہیں ؟" میں رقم طراز ہیں کہ :-

"پروفیسر فراق کی طرح میرا بھی مشغلہ یو۔پی کی ایک بڑی یونیورسٹی میں انگریزی ادب پر لیکچر دینا ہے۔ حالانکہ پروفیسر موصوف کے مقابلے میں میں بالکل نو وارد ہوں اور مجھے یہ کام کرتے ہوئے ان کے زمانے کا شاید ایک تہائی زمانہ ہی گذرا ہے مگر شاید میں اس وجہ سے انگریزی ادب کے جدید رجحانات سے زیادہ قریب ہوں۔ میں خاص طور سے شاعری پڑھاتا ہوں اور انگریزی پر اس دور کی سب سے زیادہ عالمانہ جو تصنیف پیش ہوئی ہے وہ پروفیسر فیئر چائلڈ (FAIR CHILD) کی پانچ نہایت ضخیم جلدوں میں کتاب "انگریزی شاعری میں مذہبی رجحانات" RELIGIOUS TRENDS IN ENGLISH POETRY ہے اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تمام انگریزی شاعری میں عیسائی مذہب کی گہری ترجمانی ہے اور اکثر جگہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ سائنس کے نظریات کی بنیاد بھی مذہبی عقائد پر

دکھی گئی۔ پروفیسر فراق کے مضمون میں یہ جملہ پڑھ کر کہ "انگریزوں کا مذہب عیسائیت نہ ہوتا تو بھی انگریزی شاعری ویسی ہی ہوتی جیسی کہ وہ اب ہے۔" میرا بے ساختہ جی چاہا کہ فیئر چائلڈ کو بھی اس بات سے متنبہ کر دیا جائے کہ ہمارے ایک محقق نے آپ کی زندگی بھر کی کاوش پر ایک جملہ میں پانی پھیر دیا۔ خیر یہ تو وقتی جذبہ تھا۔ مگر اتنا میں نے ضرور کیا کہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر نریش چند صاحب کو جنھوں نے انگریزی شاعری کے مذہبی پہلو پر گہری نظر ڈالی ہے اور CONTR

-IBUTION OF ENGLISH LYRIC TO CHRISTIANITY

پر طویل مقالہ لکھا ہے۔ فراق صاحب کا یہ جملہ خاص طور پر دکھایا۔ بس اب آگے کہنے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے فراق صاحب کو کن الفاظ میں یاد کیا۔ غور سے دیکھا جائے تو یورپ کا ادب عام طور پر اور انگریزی ادب خاص طور پر اُس وقت بھی مذہب کے خلاف نہیں گیا جبکہ سائنس اور مذہب کا تصادم اپنے کمال پر تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ادب ہی نے مذہب کی سائنس کے خلاف سب سے زیادہ طرفداری کی۔

ایسے ادیب ضرور نظر آئیں گے جو مذہبی رسموں، پادریوں کی ہٹ دھرمی اور مسائل کی خشکی کو مطعون کرتے ہوں مگر بنیادی طور پر یہ بھی مذہب اور عیسائیت کی روح سے ہم آہنگ ہوں گے اور فی زمانہ تو ادب کے مذہبی عنصر پر ہی زور دیا جا رہا ہے۔ میری سب سے زیادہ دلچسپی ملٹن کی شاعری میں ہے اور ملٹن پر ایم۔ اے کے درجے کو لکچر دینے کے سلسلے میں مَیں نے اپنا اہم فرض سمجھ لیا ہے کہ اس پر جدید تنقید کو حاصل کرتا ہوں چنانچہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جدید

تنقیدوں میں ملٹن کے مذہبی پیغام کی اہمیت کو بہت سراہا جا رہا ہے۔ انیسویں صدی میں جب مذہب کو بیکار ماننے کا فیشن عام تھا تو ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" کے بابت یہ تنقید بھی عام تھی کہ اس کا مواد فرسودہ ہو گیا۔ مگر اس کا لکھنے کا انداز کمال ہی نہیں معجزہ ہے۔ مگر اب ملٹن کے جدید ترین عالموں میں ایک اہم عالم ڈوگلس بش (DOUGLAS BUSH) اپنی کتاب -PARADISE LOST IN OUR TIMES- میں یہ کچھ لکھتا ہے "جدید مزاج نیک و بد کی تمیز کے سلسلے میں ابہام کا عادی ہو گیا ہے۔ اس لئے ملٹن کے مطالعہ کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے لئے یہ بھی سخت ضرورت ہے کہ ایسے شاعروں سے اثر پذیر ہوں جو نیک و بد کو خاص حقیقتیں سمجھتا ہو جو آسمانی بادشاہت میں اٹل عقیدہ رکھتا اور جو انسانی زندگی پر عیسائی منکسر مزاجی اور غیر مذہبی غرور کے درمیان جنگ کو غور سے دیکھتا ہو۔ اس قسم کی رائیں ملٹن کے تمام عالموں کے یہاں ملتی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکالنے پر ہم مجبور ہوں کہ عالمانِ ادب کی توجہ مذہبی امور میں بڑھ رہی ہے اور عام طور پر ترقی یافتہ ہونے کے لئے، مذہبی ہونا بھی ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت اگر یہ پوچھا جائے کہ یورپ کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو زیادہ تر لوگ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S.ELIET) کا نام لیں گے اور اسکی شاعری تمامتر کیتھولک مذہب میں رچی ہوئی ہے اور اس کے مضامین عیسائی سوسائٹی کے نصب العین پر دنیا کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ادب میں مذہب کی اہمیت بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔"

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مضمون "اسلامی ادب۔ کیوں نہیں؟" سے یہ طویل اقتباس

یہاں صرف اس لئے نقل کرنا ضروری تھا کہ اس اقتباس کے بغیر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ ڈاکٹر صاحب کس حکمت کی بنا پر آخر اسلامی ادب کی طرف اپنے پڑھنے والوں کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ اس اقتباس کو پڑھ کر یہ اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد احسن فاروقی صاحب کیتھولک مسلمان ہیں یا پروٹسٹنٹ اور یہ کہ فقہا میں سے ان کا عقیدہ فیبر جائلڈ، ڈگلس بش، ہلٹن یا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ میں سے کس پر زیادہ ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اپنے اس مضمون میں مشورہ دیا ہے کہ

اُردو ادب کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ پست سطحی اور گمراہ کن ترقی پسندی سے الگ تھلگ ہو کر اقبال کی راہ اختیار کرے۔"

لیکن علامہ اقبال تو کہتے ہیں ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اور اس قسم کی گفتگو ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیال میں "اقتصادیات زدہ" اور "سیاست زدہ لوگوں کی اُس پست تحریک کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اپنے پست سیاسی مقاصد کو ادیبوں کے ذریعے پھیلانے کے لئے اٹھائی اور جنھوں نے مادیت پر اور خاص طور پر اشتراکی مادیت پر ادب کی بنیاد رکھی ——— فلسفۂ اشتراکیت کے موجد کارل مارکس کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اپنے مضمون میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی بہر حال علامہ اقبال کی رائے سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر اقبال تو

"قلب اُو مومن دماغش کافر است"
——— "نیست پیغمبر ولیکن دارد کتاب"

قسم کی باتیں کارل مارکس کے لئے کہہ گئے ہیں۔

خود قرآن کریم کا کوئی ورق زکوٰۃ کے تذکرے سے خالی نہیں ہے جو ایک خاص قسم کے معاشرے میں ایک خاص قسم کی اقتصادی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہے تو پھر اقتصادیات سے اسلامی ادب میں کیسے دامن بچایا جا سکے گا۔ کیا اسلامی ادب پیدا کرنے کے لئے قرآن کریم کا مطالعہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ضروری نہیں؟

بات وہی تاویلات پر آکر ٹکتی ہے کہ کس بات کی کون کیا تاویل بیان کرتا ہے اب یہی دیکھ لیجئے کہ غالب کے اس شعر کو کہ ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

فراق صاحب اور فاروقی صاحب نے اپنے مضامین "اسلامی ادب" اور "اسلامی ادب؛ کیوں نہیں؟" میں جس جس طریقے سے استعمال کیا ہے اس سے مذکورہ شعر کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ فراق صاحب کہتے ہیں کہ ع

"ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں"

غیر اسلامی بات ہے ——— فاروقی صاحب نے فرمایا ہے کہ غالب نے اس شعر میں وہی بات کہی ہے جو اسلام کے کلمۂ شہادت میں مضمر ہے اور اسلام کے ثبات کے لئے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ وہ تمام ملتوں کے مٹنے کے بعد قائم رہنے والا ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی مثال دیئے بغیر چارہ کار نہیں:-

حال و قال کی ایک محفل میں ایک صوفی منش بزرگ اس شعر پر رقت قلب میں مبتلا تھے کہ

یونہی گریہ توڑا امرودڑی رہے گی   لڑکا ہے کو انگیا نگوڑی رہے گی

ان کی اس وجدانی کیفیت کا اندازہ کیے بغیر اُس محفل کے اختتام پر جب کسی نے ان صوفی صاحب سے یہ دریافت کرنے کی گستاخی کی کہ حضرت یہ شعر آخر کس قسم کی معرفت کا آئینہ دار ہے تو فرمایا گیا کہ انگیا جسم ہے اور جو کچھ انگیا میں ملفوف ہے اُسے روح سے تعبیر سمجھو یعنی یہ کہ روح اور جسم میں اگر ریاضت الٰہی کے باعث یونہی کش مکش چلتی رہی تو جان یعنی جسم کا زیان یقینی ہے اور جسم کو کمزور کیے بغیر "نروان" حاصل نہیں ہو سکتا۔ یا پھر ڈاکٹر اقبال کے اس شعر کو کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہو

کھرا جسے اب سمجھ رہے ہو وہ کل زرِ کم عیار ہو گا

بعض بزرگ یوں سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس شعر میں DEVALUATION کے بارے میں پیشین گوئی کی تھی۔

کچھ اسی سے ملتا جلتا تصوف ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی اپنے مضمون "ادب برائے اسلام کیوں نہیں؟" میں برتا ہے۔ فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ جب غالبؔ نے یہ کہا کہ ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

تو ممکن ہے ان کا اسلامی جنت میں عقیدہ ڈھلملا گیا ہو مگر "جنت" کے لفظ کا استعمال ہی پڑھنے والے کو اس تصور کی طرف لے جاتا ہے جو اسلام سے مخصوص ہے اور جو شخص اسلام کے تصورِ جنت سے واقف نہ ہو وہ اس شعر کو بالکل نہیں سمجھ سکتا"

یہ بات اُس غالبؔ کے لیے کہی گئی ہے جس نے کہا کہ ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا   واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اس قسم کی تاویلیں پیش بندی کے طور پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے سرمد شاہ کے ؎

بت پرستم کافرم از اہلِ ایماں نیستم
سوئے مسجد می روم لیکن مسلماں نیستم

قسم کے اشعار کے بارے میں بھی تصنیف کی ہیں اور ظاہر ہے کہ مولانا روم کا یہ شعر کہ

من ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیش سگاں انداختیم

یا حضرت امیر خسرو کا اس قسم کا کلام کہ ع

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کی انھیں تاویلات کے تحت آسکے گا جب ڈاکٹر محمد احسن فاروقی غالب کے اس شعر کو کہ ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اپنے مضمون میں یہ کہنے کے لئے نقل کرتے ہیں کہ

"غالب نے اس شعر میں اسلامی رواداری کی حد دکھا رہے ہیں جس پر پیغمبر اسلام نے ہمیشہ عمل کیا۔"

تو میر تقی میر کا یہ شعر کہ ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو کہ اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

یا مومن کے اس قسم کے مقطعوں کو کہ ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بیک جنبشِ قلم سنتِ نبوی کا آئینہ دار ٹھہرا دیں گے۔

اِن تاویلات کی تصنیف سے ڈاکٹر فاروقی نے ہر ادیب اور شاعر کو آسانی سے مذہب کا علمبردار ثابت کرنے کا وہ دروازہ کھول دیا ہے کہ باید وشاید۔ اس طریقۂ استدلال سے پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو بھی اسلامی ادب کا علمبردار ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یا پھر جوش ملیح آبادی کے اس طرز کے کلام کے بارے میں کیا رائے ہے کہ ؎

رات کے وقت مئے طرب کے ہنگام
پرتو یہ پڑا بہشت سے کس کا سرِ جام
تم کون ہو، جبریل ہوں، کیوں آئے ہو؟!
سرکارِ فلک کے نام کوئی پیغام

جوش کی اس رباعی اور اقبال کے اس شعر میں کہ ؎

خودی کو کر بلند کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

آخر کتنا فرق ہے۔ یا پھر ایک جگہ کشمیر کو جنت کہے بغیر جنت کا جو تصور اس رباعی میں جوش نے پیش کیا ہے کہ ؎

ممنوع طرب سے لطفِ پیہم لینے
عصیاں کے درخت کی چھاؤں میں دم لینے

آواز دو کا شیمیرا آپہنچا جوش
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

علامہ اقبال کے ع "تو شب آفریدی چراغ آفریدم"
قسم کے کلام سے کس حد تک مختلف ہے؟!

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اپنے مضمون "اسلامی ادب کیوں نہیں" میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے جو بچپن سے اب تک غیر مذہبیت میں عقیدہ کیا وہ شاید غلط ہے مجھے مذہب کی طرف اور اس مذہب کی طرف جس کو سمجھنے کا میں سب سے زیادہ اہل ہو سکتا ہوں توجہ کرنی چاہیئے۔ حسن عسکری صاحب کی "اسلامی ادب کی تحریک" سے مجھے یہ ضرور محسوس ہوا کہ وہ اُس راستے پر جو میں اختیار کرنا چاہتا ہوں بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور حضرت فراق ہر ترقی پسند مصنف کی طرح بدلتی ہوئی قدروں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے مکمل ترقی پسندی کا حق ادا کر رہے ہیں۔"

بدلتی ہوئی قدروں کی طرف سے آنکھیں کس نے بند کر رکھی ہیں اور کن مصالح کی بنا پر اسے چھوڑیئے لیکن تعجب یہ ہے کہ یہ جاننے۔ پوچھتے کہ محمد حسن عسکری صاحب صحیح راستے پر گامزن ہیں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اب تک "شاید" کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ مجو نالہ جرس کارواں کب تک رہے گا۔

درکارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست؟

پتہ نہیں کل تک کیوں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی پنڈت رتن ناتھ سرشار اور منشی پریم چند کی اُردو ادب میں اضافے کی خدمات کا اعتراف کرتے رہے اور ان کے

مقابلے میں مولانا عبدالحلیم شرر کو "مذہب زدہ" اور "اخلاق زدہ" گردانتے رہے (ملاحظہ ہو "انگریزی ناول کا اردو ناول پر اثر" از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی" بحوالہ پنج سالہ نمبر نقوش لاہور) اور اب وہ کہتے ہیں کہ:۔

ہندی ادب میں کسی مسلمان کا کامیاب ہونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ کسی ہندو کا اردو میں"

جس کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے سامنے یہ بات کہی جائے تو وہ یقیناً یہی کہیں گے۔ کہ

بریں عقل و دانش بباید گریست

یہ اردو کب سے مشرف بہ اسلام ہوئی اور اس کی اطلاع کس ذریعے سے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی تک پہنچی، اس کی خبر تو شاید پروفیسر محمد حسن عسکری تک کو نہ ہو حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ولی دکنی سے لے کر یا اس سے بھی پہلے سے لتا منگیشکر تک اردو کی خدمت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ لتا منگیشکر کے نام پر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی یقیناً چونکیں گے پر یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان کی ترویج میں جو حصہ لتا نے لیا ہے (چاہے یہ خدمت دانستہ ہو یا نادانستہ) اس کا دعویٰ اور کوئی فرد نہیں کر سکتا ہندو پانی اور مسلمان پانی کی آواز لگانے سے کیا پانی کے خواص میں ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ پانی ہر حالت میں پانی ہی رہتا ہے چاہے آپ اس پر کیسا ہی لیبل کیوں نہ لگا دیں

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اپنے مضامین میں انگریزی مصنفین کا حوالہ بڑی شد و مد سے دیتے ہیں جس بہتات سے پروفیسر محمد حسن عسکری کے ہاں فرانسیسی مصنفین کے نام گنوائے جاتے ہیں اور چونکہ کسی انگریز نے یہ لکھ دیا ہے کہ سارا انگریزی ادب انجیل

کی اساس پر ہے اور اس نے کھینچ تان کر انگریزی کے اُن تمام مصنفین کو جن کا عیسائیت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا عیسائیت کا پرستار قرار دے دیا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب مصر ہیں کہ اُس انگریزی کی کتاب کی سب مسلمان روزانہ ضرور تلاوت کیا کریں جس میں اس قسم کی موشگافیاں کی گئی ہیں اور چونکہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے نزدیک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شیلے سے لے کر برنارڈ شا تک انگریزی کے تمام شاعر اور ادیب عیسائی پہلے تھے اور کچھ اور بعد میں اس لئے اردو کے تمام ادیب پہلے مسلمان ہونے کا اعلان کریں اور ادب میں اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیں، کیونکہ اُن کے نزدیک اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

خدا معلوم کن مصالح کی بنا پر وہی ڈاکٹر محمد احسن فاروقی جو اس سے پہلے کے ایک مضمون میں "نقوش" ہی میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کو "مذہب زدہ" اور "اخلاق زدہ" کہہ چکے ہیں۔ انھیں شرر کے بارے میں اب لکھتے ہیں کہ "شرر کے ناول پرانی اسلامی تاریخ کے ذریعے جدید مسلمانوں کو جگاتے ہیں"۔ اس ایک فقرے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے کئی غور طلب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ کے رکھ دی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شرر لکھنوی کے ناول ناول ہیں۔ دوسری چیز یہ کہ وہ اسلامی ہیں اور تیسرا انکشاف یہ کہ شرر کی ان تحریروں کا تعلق تاریخ سے ہے اور وہ بھی "اسلامی تاریخ" سے ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اور پھر اگر اسلامی ادب کے بارے میں یہ نقطۂ نظر ہی رکھنا ہے تو علامہ اقبال کی راہ اختیار کرنے کی اس مضمون میں کس دل سے تلقین کی جا رہی ہے۔ کیا ڈاکٹر سر محمد اقبال اور مولانا عبدالحلیم شرر کا اسلام کا تصور ایک سا ہے؟

اب سوائے اس کے چارہ کار نہیں کہ پروفیسر محمد حسن عسکری، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور پروفیسر نریش چندر اُن تمام فرانسیسی اور برطانوی مصنفین کی تصانیف کی روشنی میں جن کا نام لئے بغیر وہ توالا نہیں توڑتے اور جن مصنفین نے بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مذہبی ادب کا پرچار اپنا شعار بنا لیا ہے اور تمام غیر عیسائی ادب کو "بنسمہ" دے کر بزعم خود "آسمانی بادشاہت" سے زمین کی بادشاہتوں کے قلابے ملا دیے ہیں یہ طے کر لیں کہ اسلامی ادب سے مراد کیا ہے۔ کیا وہ صرف اس قسم کا "اسلامی تاریخی ادب" چاہتے ہیں جو مولانا عبدالحلیم شرر کی تصانیف میں ہے یا اُن کی مراد اُس "ادب برائے عاقبت" سے ہے جس کا حوالہ "صالح ادب" کے سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ایک دوست کی وساطت سے دیا ہے؟ ورنہ اقبال اور شرر کی راہ پر بیک وقت چلنے کا مشورہ تو صرف وہ فریب خوردہ شاہین پیدا کرے گا "جو پلا ہو کر گسوں میں"!

(ماہنامہ "نقوش" مارچ ۱۹۵۲ء)

مجاز کے بعد کی رات

۵؍دسمبر کی شام کو کوئی چھ بجے کے بعد جب ہم لوگ جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ پھرنے کے لئے نکلے تو ایک ریسٹورنٹ کا ریڈیو چیخا "کل صبح بلرام پور ہسپتال لکھنؤ میں اسرار الحق مجازؔ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر بینتالیس سال تھی"۔ یہ خبر ریڈیو پاکستان لاہور کے دیہاتی پروگرام میں چودھری عبداللطیف مسافر نظامی صاحب نے پنجابی زبان میں سنائی، بیوی نے یہ سن کر کہا۔ یہ تو ایک روز ہونا ہی تھا اور یہ بو شراب، دیکھا اس لیے میں شراب پینے کے خلاف ہوں لیکن تم لوگ تو بچوں سے زیادہ ضدی ہو کسی کی سنتے تھوڑی ہو۔ ایک وہ تمہارے میراجی تھے۔ پھر منٹو ہزار سمجھانے بجھانے پر بھی باز نہ آئے اور اس سے پہلے اختر شیرانی کا تم سناتے ہو کہ یہی حال تھا یا تو آدمی جوشؔ کی طرح کھاتا پیتا ہو اور پینے کی ایک حد مقرر کرے اور جوشؔ صاحب کی اس نظم سے عبرت حاصل کرے جو انھوں نے مجاز پر لکھی یا پھر شراب کو حرام سمجھے، تم لوگوں کے کھانے کو روٹی تو ہوتی نہیں اور پینے پہ پل جاتے ہو اور پھر خود بھی روتے ہو اور دوسروں کو بھی ساتھ رلاتے ہو۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو نہ تن پہ کپڑا کوئی ڈھنگ کا ہے، نہ پیٹ میں روٹی، چلیے گھر۔

میں نے بیوی سے کہا تم نہ وقت دیکھو نہ محل بس ناصح مشفق بننے سے کام رکھتی ہو۔

یہ وقت نصیحتیں کرنے کا ہے۔ میں اس وقت گھر ہرگز نہیں جاؤں ____ کہنے لگیں میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ گھر چل کر عصمت کا وہ مضمون نکال کر پھر سے پڑھتے جو انھوں نے مجاز پر لکھا ہے۔ میں نے گھر جانے کی یہ ترغیب بھی رد کردی اور کہا مجھے اس وقت ایک ایسے ساتھی کی تلاش ہے۔ جو میری طرح اس خبر سے متاثر ہوا اور میرے اس وقت کے غم میں شریک ہو سکے۔ میں ایسے ساتھی کی تلاش میں جا رہا ہوں، تم گھر واپس چلی جاؤ بچے کا ساتھ ہے اور ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔ بیوی نے کہا اچھا اتنا ہوش ابھی آپ کو ہے اور پھر کہا میں سمجھ گئی آپ کہاں جا رہے ہیں چلئے ہم بھی چلتے ہیں۔ اکیلا اس وقت میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی چنانچہ ہم لوگ ایسے ساتھی کے ہاں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ وہ تنہا بیٹھے دیوان بیدل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ خبر سنی تو دیوانِ بیدل چھوڑ کر دل پکڑ کر بیٹھ گئے اور جب انھیں پتہ چلا کہ موت ہسپتال میں ہوئی ۔ تو کہنے لگے ع

کیا دوانے نے موت پائی ہے

یہ اشارہ تھا اصل میں اکبر الہ آبادی کے اس شعر کی طرف۔ جو مجاز اپنی زندگی میں ہر ہوٹل اور ریسٹورنٹ میں جا کر پڑھتے تھے۔ کہ

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

اور مجاز جب یہ شعر پڑھتے تھے تو ان کا لہجہ وہ نہیں ہوتا تھا جس لہجے پر اکبر الہ آبادی نے یہ شعر کہا ہے بلکہ یہ شعر پڑھتے وقت ان کے لہجے میں ایسی زندگی سے ایک اکتاہٹ نمایاں ہوتی تھی جس میں کوئی گھر ہو نہ در۔ اس شعر میں مجاز نے اپنے پڑھنے کے انداز سے عجیب معنی پیدا کر دیے تھے۔

مجاز صاحب کے ان دوست نے کہا۔ ذرا سوچئے مجاز کے والدین بہن اس وقت کیا گذری ہو گی، خاص کر ماں کے دل پر۔ ابھی ان کی والدہ صفیہ کا داغ اٹھا چکی ہیں کہ یہ اور تازہ گھاؤ لگا۔ نفیس میری رفیقہ حیات نے بیچ میں لقمہ دیا۔ یہ صفیہ وہی تھیں۔ جاں نثار اختر کی رفیقہ حیات مجاز کے ان دوست نے میری بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔ صاحب میرا اور مجاز کا پورے پچیس برس کا ساتھ تھا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں اس وقت کیسی کیسی ہنگامہ خیز شامیں یاد آ رہی ہیں جو ہم لوگوں نے ساتھ گزاریں اور پھر ابھی تو اور کتنی ہی ایسی شامیں گزارنے کا خیال تھا۔ کتنی امیدیں تھیں اس جواں سال شاعر سے ابھی ہم لوگوں کو "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ بڑا نقصان ہو گیا اور بہت بے وقت۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چند ادیبوں کی ایک ٹولی مجاز کا پرسا دینے یہاں آ پہنچی۔ ان لوگوں نے بتایا کہ کراچی سے ہوائی ڈاک سے جو اخبار رات شام کو لاہور پہنچتے ہیں ان میں یہ خبر چھپی ہے اور ہم لوگ یہ خبر پڑھ کر سیدھے یہیں چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ صحافی قسم کے لوگوں نے اپنے اپنے اخباروں کے نمائندوں کی حیثیت سے مجاز اور اس کی زندگی کے کچھ حالات دریافت کرنے شروع کئے اور مجھے جب اس قسم کی پوچھ گچھ سے کچھ وحشت سے ہونے لگی تو میں نے اجازت چاہی، مجاز صاحب کے یہ دوست ہمیں چھوڑنے دروازے تک آئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر کہا، اب میں فیض کے ہاں جاتا ہوں۔ لاہور میں میرے علم میں مجاز کے اس وقت دیرینہ دوستوں میں سے صرف وہی ایک ایسے دوست ہیں جن کے ساتھ بیٹھ کر یہ غم کچھ بٹ سکتا ہے۔ ہم لوگ یہاں سے نکل کر اپنے گھر کی جانب چلے ہی تھے کہ ایک ایسے صاحب مل گئے، جن سے حال ہی میں شان الحق حقی صاحب دہلوی نے میرا تعارف اپنے لاہور کے حالیہ دورے میں کرایا تھا اور

تاکید کی تھی کہ ان سے ملتے رہا کرنا ـــــ میں اس دن کے بعد سے اتفاق سے آج پہلی دفعہ ان سے ملا۔ انھوں نے چھوٹتے ہی کہا آپ نے کچھ سُنا۔ میں نے کہا ہاں سن لیا اس سناؤنی کو کس نے نہیں سنا، کہنے لگے تو پھر چلیئے میرے ہاں کچھ مجاز کی باتیں کریں اور اس تلخ حقیقت کی تلخی کچھ دور کرنے کی کوشش کریں۔ کہنے لگے مجھے حقی صاحب اس وقت بے طرح یاد آرہے تھے اچھا ہوا آپ مل گئے۔ نفیس نے راستے میں پوچھا یہ کون صاحب ہیں، میں نے جواب دیا مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا بہر حال ایک دوست ہیں، دوست کے دوست چلو ذرا سی دیر ان کے ہاں بیٹھتے ہیں نفیس نے کہا انھیں اپنے ہاں کیوں نہ لے چلیں ـــــ میں نے کہا یہ بات تمہیں پہلے کہنی چاہیئے تھی چلو اب ٹھیک ہے۔ ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ چند خواتین کا ایک مختصر سا ہجوم ریڈیو سیٹ کے قریب سر جوڑے بیٹھا ہے، ریڈیو کی آواز سن کر میرے اور ان صاحب کے منہ سے بیک وقت ایک چیخ سی نکلی مجاز، ایک خاتون نے منہ پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم لوگ جہاں تھے وہیں ٹھٹھک کر رہ گئے اور کان ریڈیو کی آواز کی طرف لگ گئے، مجاز اپنی مشہور نظم پڑھ رہے تھے۔

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب — جیسے ملا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب

جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اور بغیر کسی اعلان کے مجاز نے یہ نظم پڑھنی شروع کی۔

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

اس نظم کے اختتام کے بعد اعلان ہوا کہ سری نگر کشمیر ہے۔ مجاز کے اس کلام کے ساتھ ہماری

آج کی تیسری مجلس برخاست ہوئی ـــــ سب کے منھ سے بے ساختہ نکلا یہ سری نگر تھا۔
ان صاحب نے جن کا نام یاد نہیں آرہا ہے ان خواتین سے پوچھا کب سے ہو رہا تھا یہ پروگرام؟! اور تم نے سری نگر کیسے لگایا؟! ایک خاتون نے جواب دیا ہم لوگ جب سے مجاز کی خبر سنی ہے اس کوشش میں تھے کہ کہیں سے کوئی پروگرام اگر ان پر ہو رہا ہو تو سنیں، لاہور، کراچی، راول پنڈی، آزاد کشمیر، دلی، بمبئی، لکھنؤ سارے اسٹیشنوں پر سوئی گھما گھما کر دیکھی لیکن کہیں سے مجاز پر کچھ نہ سنا پھر سری نگر لگایا تو سنا کہ ان کے اسٹوڈیو میں تیار کیے ہوئے ریکارڈ پیش کیے جانے کو ہیں اور آدھ گھنٹہ یہ پروگرام ہوا ہے۔ اچھا آدھ گھنٹہ کے ریکارڈ مجاز کے سری نگر ریڈیو کے پاس ہیں، یہ تو بہت قیمتی سرمایہ ہے ان کے پاس شان الحق کے دوست نے کہا۔ ایک نسبتاً معمر سی خاتون بیچ میں بولیں آخر جنت ہی سے ان کی آواز آئی نہ، حق مغفرت کرے ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خاتون کشمیری ہیں۔ اور خاص سری نگر کی رہنے والی ہیں۔ اپنے وطن کی جنت میں واپس پہنچنے کے لیے دن رات مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی ہیں۔ ان خاتون کو شاید خوش کرنے کے لیے ایک لڑکی نے کشمیر جنت نظیر پر جوش ملیح آبادی کی یہ رباعی سنائی جو انھوں نے اس وقت کہی تھی جب وہ مجاز کے ساتھ پہلی مرتبہ کشمیر گئے تھے ؎

ممنوع طرب سے لطف پیہم لینے
عصیاں کے درخت کی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو کاشمیر آپہنچا جوش
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

شان الحق صاحب کے دوست بولے کتنے عجیب طریقے سے اس رباعی میں

جوش نے کشمیر کو جنت کہا ہے۔ کشمیری خاتون پھر بولیں ـــــ ہائے وہ کشمیر جسے مفاد پرستوں نے اب وادی جہنم میں تبدیل کر دیا ہے۔ پاکستان تو پاکستان خود ہندوستان کے لوگ بغیر پرمٹ کے اب وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔ توبہ استغفار ـــــ اور پھر ان خاتون نے بغیر تعارف کے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ مجاز صاحب چودھری محمد علی ردولوی کے ہم وطن تھے۔ ـــــ میں نے کہا جی ہاں اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجاز کے ہم سب کا غائبانہ تعارف کرا رکھا ہے اور جیسے اب رسمی تعارف کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہی اور میں سوچنے لگا یہ ماہ پاروں کا ہدف زہرہ جبینوں کا شکار کیسی کیسی خوش مذاق خواتین کا محبوب تھا لیکن اس کے باوجود عورت وہی عورت جس کے لئے جوش نے کہا ہے ؎

آہ عورت ـــــ ! کہاں ہے تو عورت ـــــ !

ہم کو لاکھوں میں ایک بھی نہ ملی

اس عورت کے لئے مجاز زندگی بھر کیسا ترستا رہا مجاز نشے میں چور ہونے کے بعد اپنے بے تکلف احباب کی محفل میں اکثر اپنے ایسے اشعار سناتے تھے جو بڑا شاعر اپنے بے تکلف احباب میں سنانے کے لئے کہتا ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں سے ایک شعر یہ تھا ؎

موت بھی اس لئے گوارا ہے

موت آتا نہیں ہے آتی ہے

اور آخر یہ رات بھی آئی کہ مجاز نے تنگ آ کر موت کی آغوش گوارا کر لی ع

ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

یہاں سے ہم لوگ باہر نکلے تو خلیل صاحب مل گئے "لمحے" کے مصنف محمد خلیل الرحمٰن صاحب جن کا دیوان "لمحے" دنیا کے شاعروں کے مختصر ترین دیوانوں میں سے ہے خلیل صاحب نے

مجھے دیکھ کر کہا آپ تو کچھ مغموم سے نظر آ رہے ہیں، حالانکہ یہ موقع خوش ہونے کا ہے آپ مجاز صاحب ہی کی خبر سے رنجیدہ ہیں نا۔ تو بات یہ ہے کہ یہ ٹارچ جتنی تیز روشنی سے اور جتنے عرصے سے متواتر جل رہی تھی اسے آخر اسی طرح ختم ہونا تھا پینتالیس سال ایسی زندگی کے بہت سمجھنے چاہئیں جن میں ایک شخص نے "آہنگ" "شب تاب" اور "سازِ نو" جیسے تین چار دیوان پسماندگان کی ہدایت کے لئے چھوڑ دیئے ٹمٹماتے ہوئے دیے لئے جو لوگ گوشۂ عافیت میں بیٹھے رہتے ہیں وہ اگر عمرِ نوح بھی پائیں تو کس کام کی جنھیں قدم قدم پر یہ تلقین کرنی پڑے کہ ع

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

وہ ٹارچ جو آندھی اور طوفان کا مقابلہ کرے گی اور گھپ اندھیروں میں روشنی بکھیرتی رہے گی آخر ایک دن اس کے "سیل" یک لخت ختم ہوں گے ہی۔ کب تک یہ بیٹری کام دے سکتی تھی۔ میں نے کہا خلیل صاحب آپ تو اپنی جگہ ایک چلتا پھرتا مدرسۂ فکر ہیں خلیل صاحب کہنے لگے خیر یہ آپ محض اخلاق برت رہے ہیں اور اخلاق زیادہ نہ برتا کیجئے ورنہ یہ بھی ایک دن یونہی ختم ہو جائے گا۔ میں نے کہا جب روشنی ہی ختم ہو گئی تو اخلاق کب تک رہے گا۔ خلیل صاحب نے کہا کہ صاحب اخلاق اندھیرے ہی میں تو دیکھا جاتا ہے اور ہم نے محسوس کیا کہ واقعی سٹرکیں روشنیاں گل ہو جانے کی وجہ سے یکایک بھیانک اور تاریک ہو گئی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا رہا جیسے بقول فراق ع

وہ رات ہے کہ کوئی ذرہ محوِ خواب نہیں

گیارہ بج چکے تھے اور ہم خلیل صاحب سے رخصت ہو کر گھر پہنچنے کی جلدی میں تھے، کیونکہ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی اور بچہ بھی ساتھ تھا کہ مسافر صاحب گھر جاتے ہوئے مل گئے

مسافر صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ بھئی آپ لوگ مع بچے کے اس ٹھنڈ میں کہاں گھومتے پھر رہے ہیں؟ نفیس نے کہا اس کی وجہ آپ ہیں۔ نہ آپ وہ مجاز والی خبر سناتے اور نہ ہم لوگ اس وقت آپ کو یوں بے وقت یہاں ملتے۔ آپ کے منھ سے جب سے یہ خبر ریڈیو پر سنی ہے یونہی آوارہ گردی ہم لوگ بڑے پھر رہے ہیں۔ مسافر صاحب نے کہا اصل میں اس عمر میں جب کوئی مرجائے تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چالیس برس ہی کی عمر میں تو جاکر انسان اس لائق ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کچھ کام کر سکے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ پیغمبری کا دعویٰ زیادہ تر پیغمبروں نے چالیس سال کی عمر سے پہلے نہیں کیا اور چونکہ شاعری جزویست از پیغمبری اس حساب سے مجاز صاحب نے صرف پانچ برس کی عمر پائی اور جن لوگوں کا مقصدِ حیات انسانیت کی بھلائی ہو ان کے لئے پانچ برس تو کیا پچاس برس بھی کم ہیں اور عمر گنی جاتی ہے چالیس برس کے بعد سے۔ اس قسم کی باتیں کرتے کراتے ہم لوگ گھر پہنچے تو دروازے ہی میں ایک کاغذ پڑا ہوا ملا۔ یہ پرچہ ایک سالہ کے اڈیٹر نے لکھا تھا۔ دیکھئے مجاز پر جو مضمون آپ لکھیں گے وہ ہمارے لئے ہوگا۔ اور میں یہ پرچہ پڑھ کر اس سوچ میں پڑ گیا کہ مجاز پر مضمون لکھنا کوئی منھ کا نوالہ تھوڑے ہی نہیں اور پھر جتنی فرصت اس مضمون کے لکھنے کے لئے چاہئے وہ مجھ جیسے ——— فکر معاش عشق بتاں، یادِ رفتگاں، میں گرفتار کو کہاں نصیب

بستر پر لیٹ کر ساری رات میں نے اسی سوچ میں آنکھوں میں کاٹ دی، کیسی کیسی ہنگامہ پرور شامیں آنکھوں میں پھر گئیں۔ وہ دلی کے کافی ہاؤسوں اور میکدوں میں گزری ہوئی شامیں، جس میں مجاز، جاں نثار اختر، جذبی، شان الحق حقی، شاہد لطیف اور کبھی کبھی ساغر نظامی وغیرہ بیٹھ کر گھنٹوں دنیا جہاں کے مسائل پر اپنے اپنے انداز میں

رائے زنی کرتے۔ دلی کے کتب خانہ علم و ادب سے جب ہم لوگ اُٹھتے بلکہ اُٹھتے کیا اٹھا دئے جاتے، چاہے کتنی ہی دھواں دھار بحث کسی موضوع پر ہو رہی ہو، الحاج حافظ سید وصی اشرف مالک کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دلی آٹھ بجتے ہی شاہد صاحب مدیر ماہنامہ "ساقی" سے مخاطب ہو کر کہتے چلیے بھائی شاہد اور ان کے اس اعلان پر سب کو ہڑبڑا کر اٹھنا پڑتا۔ پھر یار لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے۔ کھانے والوں کی ٹکڑی الگ پھٹ جاتی اور پینے والوں کی الگ۔ کھانے والوں میں یعنی ان لوگوں میں جنھیں یہاں سے اُٹھتے ہی بھوک ستانے لگتی تھی ظفر قریشی، فضل حق قریشی، صلاح الدین قریشی، میجر محمد میاں، جاذب قریشی، واحد قریشی، غرض یہ کہ قبیلہ قریش کے زیادہ تر افراد پیش پیش رہتے تھے اور یہ سب کسی ایسی ریسٹورانٹ کا رخ کرتے تھے جہاں ان کی مرضی کا کھانا ان کو ملے لیکن سید انصار ناصری، بھائی شاہد (مدیر ماہنامہ "ساقی") تابش دہلوی چاہے پیتے یا نہ پیتے کبھی کھانے والی ٹکڑی کے ساتھ رہتے اور کبھی پینے والوں کی ٹولی کا ساتھ دیتے۔ میں سوچتا رہا رات بھر کیا فرصتیں تھیں اس زمانے میں ہم لوگوں کو اور کتنی فراغت ــــــ کیسی کیسی دھومیں ہم لوگ مل کر مچاتے تھے اور جس شام سب مل کر کسی کا گانا سننے جب نکلتے تو مجاز صاحب کے برجستہ اشعار اور فقرے سونے پر سہاگے کا کام کرتے مجاز جب کسی کو دیکھ کر کہتے۔

مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ

اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

تو جی چاہتا کسی کا گانا سننے کی بجائے مجاز کا کلام سنا جائے اور چنانچہ اکثر

ایسا ہی ہوتا کہ بجائے گانا سننے کے مشاعرہ ہو جاتا۔ مجاز صاحب سے ایک دن بسم اللہ نے کہا یار تم جب سناتے ہو پرانی ہی چیز سناتے ہو کبھی کوئی نئی نظم یا غزل بھی تو سنایا کرو ــــــ تو مجاز نے کہا۔ ابھی میری پرانی ہی نظمیں لوگوں کو یاد نہیں ہوئیں میں نئی نظم جب کہتا ہوں جب دیکھ لیتا ہوں کہ جتنا میں اب تک کہہ چکا ہوں وہ سب کو زبانی یاد ہو گیا۔ ایک دفعہ ایک بے قافیہ ردیف کی شاعری بلکہ بقول بھائی شاہد کے چھوٹی بڑی شاعری کے ایک مبلغ نے مجاز سے کہا کہ لیجئے مجاز صاحب ایک غزل ہم نے بھی کہی ہے لیکن بڑی مشکل سے یہ چند شعر ہوئے ہیں۔ مجاز نے کہا ہاں صاحب قافیہ ردیف کا خیال رکھ کر برابر کے مصرعے کہنا بڑا مشکل ہے۔ ان صاحب نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا لیکن یہ غزل کہنے میں مجھے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ مجاز صاحب نے اس پر کہا ہاں اگر انسان موزون طبع ہو تو پھر غزل کہنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ مجاز کی اس قسم کی باتیں یاد کرتے کرتے میں نے سوچا کہ میں پہلی دفعہ مجاز سے کب کہاں اور کیسے ملا تھا لیکن وہ جو جوش نے کہا کہ ع

نسیان مجھے لوٹ رہا ہے یارو

تو حافظہ اس قدر جواب دے رہا ہے کہ کچھ یاد ہی نہیں آتا ــــــ اتنا یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ میں نے مجاز کو دیکھا تھا اور اس وقت تابش نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس دور کے مجاز کو دیکھ کر یہ تصور نہیں کر سکتے کہ یہ شخص اب سے کچھ عرصہ پہلے جب علی گڑھ میں ایم اے میں پڑھتا تھا کس درجہ حسین اور تندرست تھا۔ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی پہلے ان پر لیکن اب انھوں نے شراب نوشی زیادہ کر دی ہے اور یہ قبل از وقت بوڑھے ہو رہے ہیں۔ مجاز جس زمانے میں دلّی میں آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں کے

پندرہ روزہ رسالے "آواز" کے اڈیٹر تھے۔ اس سے بھی پہلے کی ——— باتیں یاد آرہی تھیں لیکن یہ کسی طرح یاد نہیں آرہا تھا کہ پہلی دفعہ میں کب، کہاں اور کیسے ان سے ملا، ہاں آخری ملاقات خوب یاد ہے۔ جیسے کل ہی کی بات ہو۔ ۱۹۵۰ء میں۔ جب یہ پہلی اور آخری بار پاکستان آئے اور کراچی سے لاہور پہنچے تو جہاں ان سے مڈبھیڑ ہوئی وہیں الیاس عشقی صاحب اور اظہار حسین کاظمی صاحب بھی تھے۔ انھیں دنوں یہاں لاہور میں ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک پروگرام نشر ہوتا تھا جس کا عنوان تھا "بغیر عنوان کے" اس پروگرام میں ان کے انٹرویو اور کلام کا ریکارڈ ریڈیو اسٹیشن میں تیار ہونا تھا۔ ریکارڈنگ سے پہلے لوگ ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ایک صاحب نے کچھ انڈرگراؤنڈ قسم کی زندگی گزارنے والوں پر لعن طعن شروع کردی مجاز صاحب جو ہر بات کا ہمیشہ دلچسپ پہلو ہی دیکھنے کے عادی تھے ان سے کہنے لگے کہ صاحب ایک دن سب کو انڈرگراؤنڈ جانا ہے ——— آج وہ کل ہماری باری ہے ———!! اس فقرے پر عشقی صاحب نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا اب اسی بات پہ چائے پی جائے ——— مجاز نے میری طرف حسرت سے دیکھ کر کہا ——— اچھا صاحب چائے ہی سہی۔ گویا پینے کی کوئی چیز ہے تو شراب ہے، بھلا چائے کا پینا بھی کوئی پینا ہے ——— میں نے کہا یہ آپ نے پاگل خانے کی سیر بھی شروع کردی ہے کہنے لگے ہاں سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی ، پھر یہ کہ ہم لوگوں کی قسمت میں اگر دیوان خانہ یا جیل خانہ نہیں ہے تو کیا پاگل خانے بھی نہ جائیں ——— کوئی تو خانہ آخر ہونا چاہیے۔

پھر بہت دیر تک منٹو اور فیض کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ منٹو اس زمانے میں پاگل خانے میں تھے اور فیض جیل خانے میں کہنے لگے۔ جو لوگ ضرورت سے زیادہ

سوچتے ہیں انھیں یا تو پاگل خانے جانا پڑتا ہے یا جیل خانے ــــ پھر مجھ سے پوچھا سنا ہے تم نے شادی وادی کر لی ــــ کراچی میں کچھ لوگوں سے اس حادثے کی خبر مجھے ملی، میں کہے ہاں ــــ کہا ــــ یار یہ شادی کے بعد جو وادی لگی رہتی ہے اس سے میں بہت ڈرتا ہوں، اس وادی میں پھنس کر انسان پھر کسی اور کام کا نہیں رہتا، بچوں کو کندھے سے لگائے لگائے پھرنا پڑتا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے صبح ہو گئی اور میں نے خیال کیا کہ زیادہ نہیں سوچنا چاہیے کیونکہ سوچتے ہی سوچتے آخر کار مجاز کے دماغ کی رگ پھٹ گئی لیکن لاہور کے صبح کے اخباروں میں دلی کے اخبار نئی دنیا کے حوالے سے یہ خبر مجاز کے بارے میں چھپی کہ مجاز کا انتقال ۵ دسمبر کی رات کو بلرام پور ہسپتال میں بہت پراسرار طریقے پر ہوا ان کے جسم پر جلنے اور پٹنے کے نشان تھے۔ مرنے کی رات سے ایک رات پہلے وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ کسی شراب کی دوکان میں گئے تھے اور اس دوکان میں وہ صبح بے ہوش پڑے ہوئے ملے۔ ان کے ساتھ ایک اور ان کا کوئی ساتھی بھی بے ہوش پایا گیا اور اخباروں میں چھپا ہے کہ جب وہ اس شراب کی دوکان پر گئے تھے تو ایک پہلوان بھی ان کے ساتھ تھا۔ اسرار الحق مجاز کی اس پراسرار موت کا یہ پتہ اب تک نہیں چل سکا کہ کن وجوہ سے ہوئی اور یہ جسم پر ان کے چوٹوں کے اور جلنے کے نشان کیوں ہیں اور ان پہلوان صاحب کا اس حادثے میں کتنا ہاتھ ہے اور وہ ساتھی کون تھا جو ان کے ساتھ ہی اس شراب کی دوکان میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ مجاز تو کسی سے کبھی لڑنے یا لڑنے والا آدمی تھا نہیں۔ اس نے تو اپنا پہلا دیوان آہنگ "بھی کسی" کے نام۔ اس لیے معنون کیا کہ کسی کی دل آزاری نہ ہونے پائے اور بقول خود مجاز کے TREE TO WH- OM IT FITS کا مضمون رہے لیکن وہ جو گاندھی کے مرنے پر برنارڈ شا نے کہا تھا کہ

زیادہ اچھا ہونا بھی ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا ــــ معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہوئی ہوگی۔
کاش مجاز اتنا اچھا بحیثیت انسان کے نہ ہوتا جتنا اچھا وہ شاعر تھا یا کاش وہ
بقول خلیل صاحب اتنی زیادہ بیٹری اتنے کم وقت میں خرچ نہ کرتا۔ مسافر صاحب ٹھیک
کہتے ہیں کہ کام کرنے کا وقت تو اصل میں چالیس سال کے بعد ہوتا ہے لیکن اس شخص نے
زندگی کو کبھی زیادہ اہمیت ہی نہ دی اور غالب کی اس نصیحت پر عمل پیرا رہا ؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

منٹو کے مرنے پر ابھی حال ہی میں کس حسرت سے مجاز نے کہا تھا۔

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

اور اب جو مجھ سے کہا جا رہا ہے کہ مجاز پر کوئی مضمون لکھ دو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ
کہاں سے یہ مضمون شروع کروں اور کہاں ختم کروں۔ مجاز نے اپنی زندگی میں جو فقرے کہے
ہیں اگر وہ سب یکجا کر دیئے جائیں تو ایک خاصی ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی بن سکتی
ہے لیکن مجھ جیسا فکرِ معاش عشق بتاں، یادِ رفتگاں میں گرفتار کیسے اس فرض سے عہدہ برآ
ہو سکتا ہے۔ میں مجاز پر مضمون لکھنے کی فرصت کہاں سے لاؤں یہاں تو دل لے
خون کرنے تک کی فرصت نہیں ع

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

(ماہنامہ "ادب لطیف" جنوری ۱۹۵۶ء)

وہ منہیں کیوں لیے ہے تھے؟

مجھ جیسے دو سو ڈھائی سو روپے ماہانہ آمدنی کے لوگ کبھی بال بچوں کے ساتھ پکچر دیکھنے کا تصور بھی اس لئے نہیں کر سکتے کہ ایک تو بقول انگریزوں کے اس آمدنی میں دونوں سرے ہی ملانے مشکل ہوتے ہیں۔ دوسرے لنگوٹی میں اگر پھاگ کھیل بھی لیا جائے تو پردہ سیمیں پر بجائے فلمی اداکاروں کے لین داروں کے بھوت رقصاں نظر آتے ہیں، اس لئے مجھ جیسے بے حیثیت لوگ ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں کہ "کم خرچ بالا نشیں" ہونے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور شہر میں کوئی پکچر پرانی ہو کر رعایتی ٹکٹ پر دکھائی جانے لگے۔

لاہور میں "ہم لوگ" فلم متعدد بار دکھایا گیا اور ہر دفعہ فلمی زبان میں اس پکچر نے بیحد "رش" لیا لیکن مجھے باوجود احباب کے مطعون کرنے کے کسی مرتبہ بھی اس فلم کی زیارت کی سعادت نصیب نہ ہوئی حالانکہ کچھ ایسی ؏

ایں سعادت بزور بازو نیست

قسم کی بات بھی نہیں تھی لیکن سوال وہی ہاتھ خالی ہونے کا تھا۔ گو ؏

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

اور یوں بھی آیا ہے کہ ؏

ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

لیکن ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ جیتے جی خالی ہاتھ پھرتے ہیں ع

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

اس دفعہ بھی یہی ہوا کہ "ہم لوگ" فلم کی نہی کاپی" لاہور کے رٹز سینما میں جب لگی ۔ جسب معمول ہاتھ پہلی تاریخ کو بھی خالی نہ تھا لیکن بیوی اور بچے سے چونکہ وعدہ کر لیا تھا کہ چاہے اِدھر کی دنیا ادھر ہو جائے دیکھنے ہم بھی جائیں گے چاہے خود تماشا بننا کیوں نہ پڑے چنانچہ کفا جفا کر کے ہم لوگ "بائیسکوپ" دیکھنے جا پہنچے اور ایک روپیہ ساڑھے چھ چھ آنے کے "تین ٹکٹ لے کر رعایت کی وجہ سے دو روپے پانچ آنے والے درجہ میں بٹھا دیئے گئے ۔

اندر جا کر سینما ہال کا یہ حال دیکھا کہ سینکڑوں آدمی بیٹھے مونگ پھلیاں یا چلغوزے یوں "کورس" میں باجماعت چبا رہے ہیں جیسے جبڑوں کی یہ ورزش اگر جاری نہ رکھی گئی تو انھیں سینما ہال سے نکال دیا جائے گا ، بیوی نے کہا ان لوگوں میں بیٹھ کر پکچر دیکھنا تو لوہے کے چنے چبانا ہے ، میں نے کہا ہاں مگر کیا کیا جائے "باہمیں مردماں بباید ساخت" اور پھر یہ کہ اب کو بیٹھان کو صابن کھانا ہی پڑے گا ۔

پکچر جب شروع ہوئی ——— تو ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہی پہلی تاریخ کو اکتیس تاریخ کا سماں ، تن ڈھانکنے اور پیٹ پالنے کا رونا اور قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے گھر کے افراد کی آپس ہی میں تو تو میں میں ، بچوں کی تعلیم بیماروں کی دوا دارو اور بے روزگاری کا ماتم ۔ بوڑھے ماں باپ کا جوان لڑکا روزگار سے محروم جوان لڑکی دق میں مبتلا اور چھوٹا بچہ اسکول نہ جانے پر مجبور ۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ بڑے میاں کو بڑے بیوں

کے ہاں شادی میں شرکت کرنی تھی، بیوی کو دھوتی کرتہ انھوں نے دھونے کے لئے دیا
کہ یہ جب سوکھ جائے گا تو اسے پہن کر شادی میں جائیں گے۔ خود لنگوٹی باندھ کر کپڑے سوکھنے کا
انتظار کر رہے تھے کہ اطلاع ملی وہ پرانا دھوتی کرتا جو بیوی نے الگنی پر ڈالا تھا کوئی چھتنوں کی
چھتوں لے اڑا ـــــ اس خبر پر فلم کے اس گھر میں تو کہرام مچ گیا لیکن سینما ہال میں وہ قہقہے لگے
جیسے یہ کوئی کومک سین تھا، تماشائیوں کے ان قہقہوں چہچہوں پر میری بیوی نے مجھ سے پوچھا
یہ لوگ ہنس کس بات پر رہے ہیں ـــــ ؟ میں نے جواب دیا یہ لوگ شاید اپنے دکھوں کو
ہنسی میں اڑا دینے کے اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ کہنے لگیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے
جیسے یہ لوگ ہم پر قہقہے لگا رہے ہیں ـــــ میں نے کہا ان میں سے بھی بہت سے لوگوں کا
کچھ اس سے بہتر حال نہیں ہے لیکن ؏

ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

کے پہلے حصے پر اس وقت یہ لوگ عمل کر رہے ہیں، پھر میری بیوی کی توجہ پکچر کی طرف ہوگئی
اور وہ آپ ہی آپ کہنے لگیں کہ آمدنی تو ان لوگوں کی اسی روپے مہینہ دکھائی جا رہی ہے
لیکن مکان ان کے پاس اتنا بڑا ہے، ہم تو پچاس روپے کرایہ دے کر اتنے تنگ و تاریک
اور چھوٹے مکان میں رہتے ہیں کہ جس میں نہ جاڑوں میں دھوپ آتی ہے نہ گرمیوں میں
ہوا میں نے بیوی سے کہا یہ پکچر پرانی ہے اس وقت مکانوں کے کرائے اتنے زیادہ
نہیں تھے، کوئی آج تھوڑا ہی بنا ہے یہ فلم ـ! بیوی نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔
کہ خیر چار پانچ برس پہلے بھی اسی روپے مہینہ کی آمدنی والا اتنے بڑے مکان میں نہیں
رہ سکتا تھا، میں نے بیوی کو بہلایا ممکن ہے یہ ان کے گھر کا مکان ہو اور آگے چل کر یہ بات
کھل جائے لیکن انھوں نے مجھے وہیں قائل کر دیا کہ اگر یہ بات ہوتی تو یہ لوگ مکان بیچ کر

یا رہن رکھ کر اپنی جوان لڑکی کی پرانی بیماری کا علاج کرتے ۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سینما ہال میں ایک اور زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کھیل کا ہیرو اپنے پیٹ پر پٹی باندھ کر اپنے اُس دوست کے لئے کھانا لے کر آیا تھا جسے رہنے کو مکان تک نصیب نہیں تھا اور اس لئے فٹ پاتھ پر ڈیرہ جماتا تھا۔ کھانا کھا کر اس فٹ پاتھ نشین دوست نے ہیرو سے کہا کہ "میں اس مدارات کے بدلے میں کبھی تمہارے کام نہیں آؤں گا میں صورت ہی کا کالا نہیں دل کا بھی کالا ہوں، تمہاری پیٹھ مڑتے ہی تمہیں گالیاں دونگا اور کسی معاملے میں کبھی تمہاری مدد نہیں کروں گا میں چار سو بیس ہوں اس لئے کہ یہ دنیا ساری کی ساری چار سو بیس ہے۔" ان باتوں پر سینما ہال کے تماشائیوں کا فلک شگاف قہقہہ پھر ہمارے سروں پر سے گذر گیا، اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں۔

رفتہ رفتہ جب یہ کہانی اور آگے کھسکی تو معلوم کہ مذکورہ گھر کی دق کی مریض لڑکی پر سامنے والے مکان کا ایک لنگڑا نوجوان میوزک کمپوزر عاشق ہے اور کھیل کے ہیرو پر جو فاقوں کی وجہ سے نڈھال اور غلط سماج کی وجہ سے پراگندہ خیال رہتا ہے کسی امیر گھر کی ایک صحت مند اور مجسم رقص و نغمہ ایک نوکرانی ہزار جان سے فریفتہ ہے اور "دمشق میں قحط سالی کے باوجود ۔ فراموش کردند عشق" کی وہ قائل نہیں، یہ لڑکی جب کھیل کے ہیرو کو اور لنگڑا میوزک کمپوزر جب ہیرو کی بہن کو نغمہ و رقص سے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہیرو اپنی بیمار بہن، اسکول میں نہ جا سکنے والے چھوٹے بھائی اور مفلوک الحال بوڑھے ماں باپ کے خیال اور ہیرو کی بہن اپنی مستقل بیماری کے باعث محبت کا جواب محبت سے دینے سے قاصر ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اپنے اس فطری حق کا گلا گھونٹتے ہیں۔ اس "سچوایشن" پر بھی ہال میں ہنستے ہنستے لوگ بے حال ہو ہو گئے اور ہم

تصویر حیرت بنے بیٹھے رہے کہ یا تو ہم لوگ اس کہانی کو غلط سمجھ رہے ہیں یا پھر یہ لوگ جو ہنس رہے ہیں "مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"

پر ہم سے بھی زیادہ عمل پیرا ہیں۔

کہانی اب کلائمکس کی طرف بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ ہیرو کا باپ جس سیٹھ کے ہاں نوکر ہے وہاں سے دو ہزار روپیہ ایسے وقت گھر میں لے کر گھستا ہے جب گھر کا چولہا اوندھا پڑا ہے، بیٹی کھانس کھانس کر بے حال ہوئی جا رہی ہے، ہیرو فکرِ معاش اور عشقِ بتاں سے تپتا ہوا واپس لوٹتا ہے اور چھوٹا بچہ بھوک سے نیم بے ہوش سا ہوا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں ہیرو کا باپ اپنی فاقوں سے چور بیوی کے ہاتھ پر دو ہزار روپے رکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے کہ یہ روپے کہیں چھپا کر رکھ دو صبح مجھے ان کی ہنڈی بنانی ہے مجھ سے بھی ان روپوں کو چھپا کر رکھنا کہیں میں ہی حواس نہ کھو بیٹھوں۔ اس قسم کی باتوں پر تماشائی پھر ہنستے ہنستے بے تاب ہو جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے جیسے ہم لارل ہارڈی یا باب ہوپ کی کوئی امریکن تصویر دیکھ رہے ہیں، ہنساتے ہنساتے لٹا دینے والی "کامیڈی"!

اسی رات اپنی بہن کے کھانسنے کی دل خراش آواز سے ہیرو پریشان ہو کر اٹھتا ہے اور بے قابو ہو کر وہ صندوق سر پر اٹھا لیتا ہے جس میں سیٹھ صاحب کے دو ہزار روپے ماں نے چھپا کر رکھے تھے اور اپنے اسی دوست کے پاس پہنچتا ہے۔ جو خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو "ہا ہانگ ڈبل چار سو بیس" کہتا تھا اور جس نے جب ایک دفعہ کسی پڑوسی کا مرغا چرا لیا تھا تو ہیرو یہ مرغا اس کے ہاتھ سے چھین کر مرغ کے مالک کے ہاں خود جا کر چھوڑ آیا تھا۔ آج جب وہ اسی دوست کے پاس باپ کی امانت کے دو ہزار روپے چرا کر لایا تو یہ دوست، ہیرو کی اس حرکت کو صرف مذاق سمجھتا رہا اور اسے اس بے وقت

کے مذاق پر جب اُس نے اُلٹی سیدھی سنائیں تو اس پر بھی تماشائیوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

اب کہانی اور سنجیدہ ہو گئی تھی کیونکہ ہیرو کے دوست نے ہیرو کے جانے کے بعد جب دیکھا کہ واقعی ہیرو دو ہزار روپے گھر سے چرا لایا تھا اور بطور امانت اس کے پاس رکھ گیا تھا تو یہ شخص دو ہزار روپے لے کر سیدھا قمار خانے جا پہنچا اور وہاں پیشہ ور جواریوں کے ہاتھوں ہیرو کی امانت گنوا بیٹھا۔ اس سین پر بھی خوب خوب تالیاں پٹیں اور دیر تک سینما ہال میں لوگ ہنستے رہے۔ ادھر ہیرو کے گھر میں صبح جب روپیہ گم ہونے کا بھانڈا پھوٹا تو صفِ ماتم بچھ گئی۔ سیٹھ صاحب، ہیرو کے باپ کے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے خود اپنے اسی روپے لینے کے ملازم کے گھر آ دھمکے، ہیرو نے سیٹھ صاحب کو دیکھ کر کہا "سیٹھ صاحب آپ کی لکڑی کی موٹھ سونے کی، گھڑی سونے کی، اچکن کے بٹن سونے کے۔ یہ سونے کا اور وہ سونے کا۔ آپ کا تو دل اور دماغ بھی معلوم ہوتا ہے سونے ہی کا ہوگا"۔ ہیرو کے اس طنز پر سیٹھ جی تو خیر کھسیانی ہنسی ہنسے لیکن یہ ہمارے تماشہ دیکھنے والے خوب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہاں پہنچ کر شاہد "ہاف ٹائم" ہو گیا اور اس "ہاف ٹائم" کے بعد کہانی اس فلم کی جب اور زیادہ تنت کی طرف بڑھی تو ہیرو کا باپ امانت میں خیانت کے جرم میں جیل جا چکا تھا۔ بنیئے نے آٹا دال قرض دینا اور ڈاکٹر نے ہیرو کی بہن کا ادھار علاج کرنا ترک کر دیا تھا، ہیرو کے اس "چار سو بیس" دوست نے حالات سے تنگ آ کر ہیرو کے مکان کی چوتھی منزل سے زقند لگا کر خودکشی کر لی تھی اور ہیرو اس شبہ میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا تھا کہ اس نے اپنے دوست کو قتل کیا ہوگا۔ یہاں عدالت کے اس سین میں سارے تماشائی "با ادب با ملاحظہ ہوشیار"

ہو کر بیٹھ گئے۔ اس فلم میں ان تماشائیوں کے حساب سے خاموش بیٹھ گے دیکھنے کا صرف یہ عدالت ہی کا سین نکلا اور جب ہیرو نے یہاں خطیبانہ انداز میں ایک ایسی تقریر کی جس سے موجودہ نظام کی بیخ کنی ہوتی تھی تو سارے تماشائی دم سادھے بیٹھے رہے اور جب اس تقریر کے خاتمے پر ہیرو اس غلط سماج کے منھ پر تھوک کر بلکہ خون تھوک کر مر گیا تو سب تماشائیوں نے تالیاں بجائیں اور قہقہے نہیں لگائے!!

اس کے بعد دیکھنے والوں کا مجمع تھوڑی دیر کے لئے سنجیدہ ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ کہانی یہیں ختم ہو جائے گی ــــ لیکن جن لوگوں کے لئے میر تقی میر جیسے تقہ شاعر کو بھی یہ شعر کہنا پڑا تھا کہ ؎

کرتے ہیں آواز فقیری دیتے ہیں دستک سو سو بار

پتھر گھر میں پھینکتے ہیں زنجیر در کھڑکاتے ہیں

انھیں لوگوں کے خیال سے اس کہانی کو اس تمنت کے بعد ول آگے بڑھایا گیا کہ اپنے گھر کے حالات سے متاثر ہو کر ہیرو کی بہن نے جو ناٹک لکھا تھا وہ بالکل فلمی اتفاق سے ایک تھیٹریکل کمپنی نے پیش کرنا طے کر لیا اور باوجود اس تھیٹریکل کمپنی کے مالک کے منع کرنے کے اس میوزک کمپوزر نے جو اس فلم کے ہیرو کی بہن پر عاشق تھا یہ خطرہ مول لے لیا کہ وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ مل کر یہ ڈرامہ اسٹیج کرے گا۔ تھیٹر کے مالک نے اس سر پھرے نوجوان کا یہ جوش و خروش دیکھ کر جب اسے سمجھایا کہ بھائی لوگ تماشہ اس لئے دیکھنے نہیں آئے کہ انھیں زندگی کے حقائق سے روشناس کرایا جائے انھیں تو لڑکیوں کا ناچ رنگ چاہیے۔ وہ گھروں کے دکھوں سے تنگ آکر جب کھیل تماشہ دیکھنے آتے ہیں تو یہ نہیں چاہتے کہ انھیں کی زندگی اُن کے سامنے بے نقاب

کر کے رکھ دی جائے، لڑکیاں اسٹیج پر بُلواؤ اگر پیسہ کمانا چاہتے ہو ——— تو اس پر ہال میں بیٹھے ہوئے سب تماشائیوں نے باآوازِ بلند آمنّا اور صدقنا کہا ——— لیکن جب اُس دق کی مریض اور سر پھرے میوزک کمپوزر کی محبوبہ کا لکھا ہوا وہ ناٹک اسٹیج پر کھیلا گیا تو جو تماشائی پردۂ سیمیں پر دکھائے گئے تھے انھوں نے بھی اور ہال میں بیٹھے ہوئے ناظرین نے بھی بیک وقت تالیاں بجائیں جس پر تھیٹریکل کمپنی کا مالک حیرت میں رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تھیٹریکل کمپنی کا مالک اس ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر انگشت بدنداں ہے کہ ابھی تو یہ قدیم رومن ایمپائر کے بادشاہوں اور امیروں کی طرح اپنے سامنے بھوکے شیروں اور بے بس انسانوں کی خونی جنگ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے اور آپ کے سامنے بے کس انسانوں کا گوشت پوست نچتے دیکھ کر نہال نہال ہوئے جا رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے ان کی پلک جھپکنے میں وہ کایا پلٹ ہوئی کہ یہ اس خشک ناٹک کی داد دے رہے ہیں ——— یہ کیسی بے داد ہے!

(ہفت روزہ "لیل و نہار" ۲۴ فروری ۱۹۵۸ء)

درجے کی معنی یابی اور نکتہ پروری ' اور بے اندازہ دلچسپی و دل آویزی 'ادبی نگارش کے یہ تین عناصر — اخلاق احمد صاحب دهلوی کے قریب قریب ہر مضمون میں یکساں اعتدال اور توازن کے ساتھ سامنے آتے اور پڑھنے والے کے دل و دماغ کو تسخیر کرتے چلے جاتے ہیں ۔ اخلاق صاحب کے بیان میں ایک موہنی ہے جس کا ہماری زبان میں کوئی نام نہیں ہے ۔ انگریزی میں اس موہنی کو 'it' کہتے ہیں ۔ اردو میں اس کا کوئی نام مجھے تو آج تک نہیں سوجھا ۔ اگر اس کتاب کے ناظرین میں سے کسی صاحب یا صاحبہ کو سوجھ جائے تو اپنی اس دریافت کی نوید سے راقم الحروف کو محروم نہ رکھیں ۔

لاہور : ۲۳ نومبر ۵۷ء

صلاح الدین احمد
مدیر ادبی دنیا

قیمت ۸/۲

ہماری دیگر مطبوعات

لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث	۱۳/۸
غزل اور متغزلین	"	۴/۸
جرات اس کا عہد اور عشقیہ شاعری	"	۲/-
مذہب و شاعری	ڈاکٹر اعجاز حسین	۵/۸
مختصر تاریخ ادب اردو	"	۷/-
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	۱۰/-
تنقیدیں اور خاکے	جلیل قدوائی	۳/-
آغا حشر اور ان کے ڈرامے	وقار عظیم	۴/۸
نیا افسانہ	"	۴/۸
فکر اقبال	غلام دستگیر	۴/-
مقدمہ شعر و شاعری	مولانا حالی	۱/۱۲
تاریخ قصائد اردو	جلال الدین	۳/-
پیام شباب	اختر رائے پوری	۲/-
انتخاب مضامین تہذیب الاخلاق	ابوالخیر کشفی	۱/۱۲
انتخاب مقالات حالی	"	۲/-
اردو نثری ادب	ابوالخیر کشفی و ظہیر	۴/۸
مکاتیب حالی	شیخ اسماعیل پانی پتی	۲/۸
دیوان میر درد	آسی مرحوم	۱/۸
دیوان غالب	غالب	۱/۸
دیوان حالی	حالی	۱/۱۲
انتخاب حسرت	جلیل قدوائی	۲/۸
انتخاب سودا	جلیل قدوائی	۲/۴
انتخاب مومن	وقار عظیم	۲/-
انتخاب اصغر	جمیل نقوی	۱/۸

صدر دفتر : اردو اکیڈمی سندھ

رحمت بلڈنگ ' نزد مسافر خانہ ۔ کراچی